سوشلزم کیا ہے؟

تحقیق وترتیب: عمران کامیانہ

طبقاتی جدوجہد پبلیکیشنز

دنیا بھر کے محنت کشو ایک ہو جاؤ!

’جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں‘

نام کتاب: سوشلزم کیا ہے؟

تحقیق و ترتیب: عمران کامیانہ

ایڈیشن: فروری 2018ء

تعداد اشاعت: 2500

ناشر: طبقاتی جدوجہد پبلی کیشنز 105 منگل مینشن رائل پارک لکشمی چوک لاہور

فون: 042-36365659

پرنٹرز: یاسر عمیر پرنٹرز

صفحات: 100

قیمت: 100 روپے

strugglepakistan@gmail.com

www.struggle.pk

فہرست

تعارف	05
بنیادی اصطلاحات اور نکات کی وضاحت	11
سماج	11
پیداوار	11
ذرائع پیداوار	12
پیداواری قوتیں	12
پیداواری رشتے	13
طرزِ پیداوار	13
ارتقا	13
سماج کی مادی بنیادیں	13
سماجی ارتقا کے بنیادی قوانین	14
استحصال	15
طبقہ	15
طبقاتی جدوجہد	16
کیا طبقات ہمیشہ سے موجود رہے ہیں؟	16
قدیم اشتراکی سماج	16
سماج کی طبقات میں تقسیم	18
تاریخ میں کون کون سے طبقاتی سماج ملتے ہیں؟	20
ایشیائی طرزِ پیداوار	20

ریاست	22
سامراجیت	23
پرولتاریہ	24
پرولتاریہ کا جنم کیسے ہوا؟	24
پیٹی بورژوازی	25
کمیونزم	27
سوشلزم	27
سوشلسٹ انقلاب کے فوری فرائض	29
مزدور ریاست کی عمومی ساخت اور طریقہ کار	31
کیا ایک ملک میں سوشلزم کی تعمیر ممکن ہے؟	32
مارکسزم	33
’غیر ہموار اور مشترک ارتقا‘ اور ’انقلابِ مسلسل‘	35
سوشلزم اور ’انسانی فطرت‘	39
سوشلزم اور قومی سوال	42
سوشلزم اور ماحولیات کا مسئلہ	45
سوشلزم اور خواتین	49
کیا سوشلسٹ انقلاب پرامن ہوسکتا ہے؟	53
انقلابی پارٹی کی ضرورت	55
ضمیمہ جات	57
مارکسزم کے تین سرچشمے اور تین اجزائے ترکیبی (ولادیمیر لینن)	57
جدلیاتی مادیت کی ابجد (لیون ٹراٹسکی)	64
کیا سوویت یونین کا انہدام سوشلزم کی ناکامی نہیں؟ (لال خان)	69
کیا پاکستان ایک جاگیردارانہ سماج ہے؟ (لال خان)	81
مارکسی اساتذہ کی مختصر سوانح حیات (ولادیمیر لینن)	84

تعارف

’سوشلزم کیا ہے؟‘ کا پہلا ایڈیشن ایک ایسے عہد میں شائع ہو رہا ہے جب پوری دنیا ایک انتشار اور خلفشار کی لپیٹ میں ہے۔ کرہ ارض پر عام انسانوں کی زندگیاں شاید اتنی تلخ اور کٹھن پہلے کبھی نہ تھیں۔ 2008ء کے مالیاتی کریش اور اس کے بعد سے پوری عالمی معیشت کو اپنی لپیٹ میں لے لینے والے معاشی بحران نے جہاں ایک بار پھر سرمایہ داری کی تاریخی متروکیت کو عیاں کیا ہے وہاں بین الاقوامی سطح پر سیاسی، سفارتی اور سماجی توازن کو بھی توڑ دیا ہے۔ آج افریقہ سے لیکر مشرقِ وسطیٰ اور افغانستان تک وسیع خطے سامراجی جارحیت اور پراکسی جنگوں کی لپیٹ میں ہیں۔ شام، عراق، یمن اور لیبیا جیسے ممالک بدترین انارکی اور خونریزی سے دوچار ہیں جس سے پناہ گزینوں کا ایک نیا بحران ابھرا ہے۔ ایران اور سعودی عرب کی رجعتی ریاستیں بھی شدید داخلی تضادات کا شکار ہیں۔ اِسی طرح افغانستان کے کروڑوں باسی کئی دہائیوں کی خانہ جنگی سے برباد اور دربدر ہیں۔ افغانستان پر جارحیت کے سترہ سال بعد امریکی سامراج اِس دلدل سے نکلنے کے لئے ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ پچھلے عرصے میں بالخصوص داعش کے ابھار کے بعد سے دہشت گردی کی ایک نئی لہر نے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیا ہے جس سے یورپ جیسے محفوظ سمجھے جانے والے خطے بھی بچ نہیں پائے ہیں۔ بنیاد پرستی کی یہ بربریت چاہے کسی شکل میں ہو، اِسی بحران زدہ سرمایہ داری کی غلاظت کا نچڑا ہوا عرق اور ناگزیر پیداوار ہے۔ امریکہ میں تعلیمی اداروں اور دوسرے پبلک مقامات پر سینکڑوں لوگوں کو لقمہ اجل بنا ڈالنے والے ’’شوٹنگ‘‘ کے پے درپے واقعات واضح کرتے ہیں کہ ترقی یافتہ ترین سرمایہ دارانہ معاشروں میں بھی انسان کس حد تک بیگانگی، پراگندگی اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار

ہے۔لیکن بارود کی دہشت گردی اور قتل و غارت اِس نظام کی بربادیوں کا ایک صرف ایک رُخ ہے۔منافع خوری پر مبنی منڈی کا یہ نظام دنیا بھر میں ایک خاموش معاشی دہشت گردی اور قتل عام بھی جاری رکھے ہوئے ہے۔سائنس اور ٹیکنالوجی آج جن بلندیوں کو چھو رہی ہے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔لیکن انسانوں کی وسیع اکثریت آج جس محرومی، نفسانفسی، غیر یقینی کیفیت اور مادی و روحانی غربت کا شکار ہے اس کی نظیر بھی ماضی میں نہیں ملتی۔معاشی ناہمواری تاریخ کی بلند ترین سطح پر ہے۔صرف آٹھ لوگوں کے پاس دنیا کی آدھی آبادی سے زیادہ دولت ہے اور ایک فیصد امیر ترین افراد کی ملکیت باقی سارے انسانوں کی کل جمع پونجی سے تجاوز کر چکی ہے۔پسماندہ معاشروں کے محنت کش طبقات تو نسل در نسل افلاس کا شکار رہے ہی ہیں لیکن حالیہ معاشی بحران نے امریکہ اور یورپ جیسے خطوں میں 'فلاحی ریاست'، سوشل ڈیموکریسی اور اصلاح پسندی کی دوسری شکلوں کی محدودیت اور منافقت بھی عیاں کی ہے۔بحران کا تمام تر بوجھ عوام پر لادا گیا ہے جبکہ سرمایہ داروں کی دولت میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ریاستوں کے خسارے بڑھے ہیں جس کے پیش نظر قرضے لینے کا رجحان بھی بڑھتا ہی چلا گیا ہے۔عالمی قرضہ اِس وقت 226 ٹریلین ڈالر کی سطح پر کھڑا ہے جو سالانہ عالمی جی ڈی پی کا 324 فیصد بنتا ہے۔مالیاتی کریش کے بعد سے اِس میں 74 ٹریلین ڈالر کا اضافہ ہوا ہے۔یہ قرضے سرمایہ داری کی تاریخی زوال پذیری کا اظہار ہیں۔ لیکن اِسی زوال کی عکاسی سیاست اور سفارت کے میدان میں بھی ہوتی ہے۔جہاں مودی سرکار نے ہندوستانی ریاست کے 'سیکولرازم' کی دھجیاں بکھیری ہیں وہاں ڈونلڈ ٹرمپ جیسے نسل پرست مسخرے کا دنیا کی سب کی بڑی معاشی اور عسکری طاقت کی قیادت میں آجانا لبرل جمہوریت کی تاریخی نامرادی ہے۔سب سے بڑھ کر یہ امریکی سامراج کے اپنے زوال اور بحران کی علامت ہے۔'آزاد منڈی' کے دعوے اور نعرے بھی ہوا ہو گئے ہیں اور 'سٹیٹ پروٹیکشنزم' پر مبنی پالیسیاں لاگو کی جا رہی ہیں۔یورپ میں بھی قوم پرستانہ اور یورپی یونین مخالف رجحانات کا ابھار واضح کرتا ہے کہ سرمایہ دارانہ بنیادوں پر اقوام کی کوئی 'یونین' دیرپا بنیادوں پر قائم نہیں ہو سکتی۔ایک نئی عالمی طاقت کے طور پر چین کے ابھرنے کی باتیں ہو رہی ہیں لیکن داخلی سطح پر چین بھی کئی طرح کے تضادات کا شکار ہے جو پھٹ کر ایک یکسر مختلف صورتحال کو جنم دے سکتے ہیں۔

غرضیکہ سوویت یونین کے انہدام کے بعد سرمایہ داری کے پالیسی سازوں نے 'تاریخ کے خاتمے' اور 'نیو ورلڈ آرڈر' کے جو خواب دیکھے اور عوام کو دکھائے تھے اُن کے ٹوٹنے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا ہے۔ آج سرمایہ داری کی متروکیت اور ناکامی پہلے سے کہیں زیادہ عیاں ہے۔ تازہ سروے کے مطابق امریکہ جیسے ممالک میں نوجوانوں کی نصف تعداد کے نزدیک سوشلزم ایک بہتر نظام ہے اور وہ اسے سرمایہ داری پر ترجیح دیں گے۔ یورپ میں بھی کئی دہائیوں بعد بائیں بازو کے رجحانات کا ایک نیا احیا ہوا ہے جس کی واضح مثال لیبر پارٹی میں جیرمی کاربن کی فتح ہے۔ 'اعتدال پسندی' اور 'سٹیٹس کو' کی سیاست مسترد ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

پاکستان جیسے پسماندہ ممالک کی بات کریں تو مسائل بہت تلخ ہو چکے ہیں۔ محرومی، مہنگائی، بیروزگاری اور دہشت گردی اب ناقابل برداشت ہوتی جارہی ہے۔ حکمرانوں کی معیشت کی ترقی اور گروتھ ریٹ کے خوب چرچے ہیں لیکن وسیع تر عوام کی معیشت ہمیشہ کی طرح روبہ زوال ہے۔ حکمران طبقات کے نظام کی زوال پذیری اُن کے آپسی تضادات اور ریاست کے بڑھتے ہوئے انتشار نے ہی واضح کردی ہے۔ ایسے میں بغاوت ناگزیر ہے۔ بالعموم ہر طرف مروجہ سیاست، معیشت اور حکومتوں کے خلاف ایک غصہ اور اضطراب موجود ہے۔

پچھلے کئی سالوں میں ہمیں دنیا بھر میں بیروزگاری، نجکاری، معاشی حملوں، فیسوں میں اضافے وغیرہ جیسے مسائل کے خلاف محنت کشوں اور نوجوانوں کی چھوٹی بڑی بے شمار جرات مندانہ تحریکیں نظر آئی ہیں۔ لیکن سرمایہ داری کی نہ ختم ہونے والی ذلت کے خاتمے کے لئے اِن تحریکوں کو ایک انقلابی قیادت درکار ہے جو صرف انقلابی نظریات کی بنیاد پر ہی تعمیر ہو سکتی ہے۔ انقلابِ روس کے قائد لیون ٹراٹسکی نے 1938ء میں واضح کیا تھا کہ 'عالمی سیاسی صورتحال کی بنیادی خاصیت محنت کش طبقے کی قیادت کا تاریخی بحران ہے۔'' آج بھی صورتحال کی اِس سے بہتر وضاحت شاید ممکن نہیں ہے۔ اِس کتابچے کی اشاعت انقلابی قیادت کا یہی بحران حل کرنے کی ایک کاوش ہے، جو کامریڈ لال خان اور اویس قرنی کی معاونت کے بغیر ممکن نہ تھی۔ خوبصورت سرِ ورق حسب روایت کامریڈ رنگ الٰہی نے ڈیزائن کیا۔

کتابچے کے پہلے حصے میں مارکسزم اور سوشلزم سے متعلقہ بنیادی اصطلاحات اور نکات کی آسان

وضاحت پیش کی گئی ہے اور عام طور پر پوچھے جانے والے سوالات کے مختصر جوابات دیئے گئے ہیں۔ دوسرے حصے (ضمیمہ جات) میں مارکسزم کے اجزائے ترکیبی، بنیادی فلسفے، بالشویک انقلاب، سوویت یونین کے انہدام اور مارکسزم کے بانیوں کے حالاتِ زندگی اور جدوجہد پر اہم تحریریں شامل ہیں جن کا ازسرِ نو ترجمہ خصوصی طور پر کیا گیا ہے۔

ہم امید کرتے ہیں یہ اشاعت محنت کشوں اور نوجوانوں میں مارکسزم اور سوشلزم کے نظریات کی ترویج میں بھرپور کردار ادا کرے گی اور اُس انقلابی قوت کی تعمیر میں معاون ثابت ہوگی جو نہ صرف اِس خطے بلکہ دنیا بھر سے سرمایہ داری کے جبر و استحصال کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کرنے کے قابل ہو۔

عمران کامیانہ

24 فروری 2018ء

لاہور

بنیادی اصطلاحات اور نکات کی وضاحت

سماج (Society)

سماج یا معاشرے سے مراد انسانوں کا ایسا گروہ ہے جس کے افراد محنت اور پیداوار کی تقسیم و تبادلے کے ذریعے ایک دوسرے سے جڑے ہوں۔ انسان ایک سماجی جانور ہے اور دوسرے انسانوں سے کٹ کر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا۔ تمام تر زبان، تہذیب، ثقافت اور سائنس و ٹیکنالوجی وغیرہ انسانوں کے آپسی تعلق اور اجتماعی کاوشوں کی پیداوار ہیں۔

''انسان فطرتاً ایک سماجی جانور ہے۔ کوئی بھی فرد جو حادثاتی نہیں بلکہ فطری طور پر غیر سماجی ہو یا تو ہمارے علم میں نہیں ہے یا پھر انسان سے بڑھ کر کوئی چیز ہے۔ سماج ہمیشہ فرد سے مقدم ہوتا ہے۔ کوئی بھی فرد جو سماجی زندگی نہیں گزار سکتا یا پھر اتنا خودمختیار ہے کہ اُسے (سماج کی) ضرورت نہیں ہے یا تو حیوان ہے یا پھر دیوتا۔'' (ارسطو، پالیٹیکس)

''سماج محض افراد پر مشتمل نہیں ہوتا بلکہ ان کے باہمی رشتوں، یعنی اُن رشتوں کا اظہار کرتا ہے جن میں یہ افراد بندھے ہوتے ہیں... غلام ہونا اور (آزاد) شہری ہونا سماجی خصوصیات اور انسانوں کے آپسی رشتے ہیں۔ کوئی انسان بذات خود غلام نہیں ہوتا بلکہ کسی سماج کے اندر اور اس کے ذریعے غلام ہوتا ہے۔'' (کارل مارکس، 'Grundrisse'، سرمائے سے متعلق باب)

پیداوار (Production)

پیداوار سے مراد فطرت کی فراہم کردہ چیزوں کو محنت کے ذریعے انسانی ضروریات کے مطابق ڈھالنے کا عمل ہے۔ انسانی رگوں، پٹھوں اور دماغ کا پیداواری استعمال محنت کہلاتا ہے۔ محنت ہی وہ عامل ہے جس کے ذریعے انسان فطرت پر اثر انداز ہوتا ہے، اپنے ماحول کو تبدیل کرتا

ہے اور اپنی ضروریات کا سامان کرتا ہے۔ انسان' فطرت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ فطرت کا ہی حصہ ہے۔ لیکن فطرت کا حصہ ہونے کے باوجود اسے تبدیل بھی کرتا ہے اور اِس عمل میں خود بھی تبدیلی کے عمل سے گزرتا ہے۔ یوں کسی بھی سماج میں فطرت اور انسانی محنت ہی تمام تر دولت کے ماخذ ہوتے ہیں۔ مادہ انسانی ذہن میں آ کر ایک معیاری تبدیلی سے خود اپنے بارے میں باشعور ہو گیا ہے۔ اس لئے انسان فطرت میں ایک موضوعی کردار ادا کرنے کے قابل ہے۔

ذرائع پیداوار (Means of Production)

جیسا کہ اصطلاح سے واضح ہے کہ ذرائع پیداوار سے مراد وہ تمام تر ذرائع ہیں جن سے انسان پیداوار کرتے ہیں۔ انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: 1) آلاتِ پیداوار، یعنی وہ چیزیں جن کے ذریعے محنت کی جا رہی ہوتی ہے۔ ایک سادہ سی درانتی یا ہتھوڑے سے لیکر جدید ترین کمپیوٹر اور روبوٹ آلات پیداوار ہی ہیں۔ 2) 'Subjects of Labour'، یعنی وہ چیزیں جن پر محنت کی جا رہی ہوتی ہے۔ خام مال، کچ دھاتیں وغیرہ۔ زمین تمام تر خام مال کا ماخذ اور محنت کا 'آفاقی سبجیکٹ' (Universal Subject) ہے۔

''وہ تمام چیزیں جن کو محنت ان کے ماحول سے جدا کرتی ہے، اُس محنت کا سبجیکٹ بنتی ہیں جو فطرت خود سے مہیا کرتی ہے۔ ان میں سے ایک مچھلی ہے جسے ہم اس کے ماحول سے پکڑتے ہیں، اور درختوں کے تنے جنہیں ہم آزاد جنگلوں کی زمین پر گراتے ہیں، اور وہ دھاتیں جنہیں ہم زیرِ زمین بھرتوں سے نکالتے ہیں۔ اگر اس کے برعکس محنت کا سبجیکٹ سابقہ محنت سے چھن کر نکلے تو ہم اسے خام مال کہیں گے۔ جیسے کچ دھاتیں جو کشید کی جا چکی ہیں اور تطہیر کے لئے تیار ہیں۔ سارے کا سارا خام مال محنت کا سبجیکٹ ہے، لیکن محنت کا ہر سبجیکٹ خام مال نہیں ہوتا۔ یہ خام مال اسی وقت بنتا ہے جب یہ محنت کی بدولت کسی تبدیلی سے گزرتا ہے۔'' (کارل مارکس، 'سرمایہ' جلد اول، باب 7)

''... محنت کا آلہ ایک چیز یا پھر چیزوں کا مجموعہ ہے، جسے محنت کش خود اپنے اور اپنی محنت کے سبجیکٹ کے مابین لے آتا ہے اور جو اس کی سرگرمی کا موصل بنتا ہے۔'' (ایضاً)

پیداواری قوتیں (Productive Forces)

کسی سماج کی پیداواری قوتیں اس میں موجود تمام ذرائع پیداوار، مجموعی انسانی محنت اور

پیداوار کی تکنیک یا علم پر مشتمل ہوتی ہیں۔ پیداواری قوتوں کی سطح سے ہی متعین ہوتا ہے کہ کوئی سماج کتنا ترقی یافتہ ہے۔

پیداواری رشتے(Reletions of Production)

سماجی پیداوار کے عمل میں انسان ناگزیر طور پر جن مخصوص رشتوں یا تعلقات میں بندھ جاتے ہیں وہ پیداواری رشتے کہلاتے ہیں۔ یہ رشتے اُن کی مرضی سے ماورا ہوتے ہیں اور ان کا جمع حاصل سماج کی وہ معاشی بنیاد تشکیل دیتا ہے جس پر سیاست اور قانون کے بالائی ڈھانچے تعمیر ہوتے ہیں۔

طرزِ پیداوار(Mode of Production)

ضروریات زندگی کی پیداوار کا مخصوص انتظام یا طریقہ کار 'طرزِ پیداوار' کہلاتا ہے، جو پیداواری قوتوں اور پیداواری رشتوں کے امتزاج پر مبنی ہوتا ہے۔ طرزِ پیداوار کو عام زبان میں معاشی نظام بھی کہا جاسکتا ہے۔

ارتقا(Evolution)

'ارتقا' کا مطلب درجہ بدرجہ آگے بڑھنے اور نمو یا ترقی پانے کا عمل ہے۔ ارتقا حیاتیاتی ہو یا سماجی، ایک سست رفتار عمل ہے جو ہزاروں لاکھوں سالوں پر محیط ہوسکتا ہے۔ لیکن اِس دوران ایسے مراحل بھی آتے ہیں جب ارتقا کا عمل ایک چھلانگ لگاتا ہے اور نسبتاً کم وقت میں تیز تبدیلیاں جنم لیتی ہیں۔ سماجی سائنس میں ایسی تیز اور گہری معاشرتی تبدیلیوں کو انقلاب (Revolution) کہا جاتا ہے۔ انسانی سماج کے ارتقا میں انقلابات کلیدی حیثیت کے حامل رہے ہیں اور مارکس نے انہیں 'تاریخ کے انجن' قرار دیا تھا۔

سماج کی مادی بنیادیں(Material Basis of Society)

''جیسے ڈارون نے نامیاتی اجسام کے ارتقا کا قانون دریافت کیا، ویسے ہی مارکس نے انسانی تاریخ کے ارتقا کا قانون دریافت کیا۔ اُس نے وہ سادہ سی حقیقت دریافت کی جو ضرورت سے زیادہ نظریاتی مغز ماری کے نیچے دب چکی تھی۔ اُس نے دریافت کیا کہ سیاسیات، سائنس، مذہب اور فن کی جستجو سے پہلے انسان کو کھانے، پینے، سر چھپانے اور بدن ڈھکنے کی ضرورت ہوتی

ہے۔اس لئے زندگی کی مادی ضروریات کی پیداواراوراس کے نتیجے میں کسی عہد کے دوران حاصل کردہ معاشی ترقی کی سطح ہی وہ بنیاد ہے جس پر متعلقہ سماج کے ریاستی ادارے، قانونی تصورات، فن اور یہاں تک کہ مذہبی خیالات ارتقا پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسی بنیاد پر ان چیزوں کی وضاحت ہونی چاہیے، نہ کہ اس کے برعکس، جیسا کہ اب تک ہوتا آیا ہے۔‘‘(مارکس کی قبر پر فریڈرک اینگلز کی تقریر، 1883ء)

سماجی ارتقا کے بنیادی قوانین

’’سماج کے قانونی رشتوں اور سیاسی اشکال کو انسانی شعور کے نام نہاد عمومی ارتقا کی بنیاد پر نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ اِس کے برعکس وہ زندگی کے مادی حالات میں سے برآمد ہوتے ہیں... سماجی پیداوار کے عمل میں انسان ناگزیر طور پر مخصوص رشتوں میں بندھ جاتے ہیں۔ پیداوار کے یہ رشتے ان کی مرضی سے ماورا ہوتے ہیں اور پیداواری قوتوں کے ارتقا کے کسی مخصوص مرحلے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اِن رشتوں کا جمع حاصل سماج کا معاشی ڈھانچہ تشکیل دیتا ہے۔ یہی وہ حقیقی بنیاد ہوتی ہے جس پر قانون اور سیاست کے بالائی ڈھانچے تعمیر ہوتے ہیں... انسانوں کا شعور اُن کے وجود کا تعین نہیں کرتا بلکہ اُن کا سماجی وجود اُن کے شعور کا تعین کرتا ہے۔ ارتقا کے ایک خاص مرحلے پر سماج کی مادی پیداواری قوتیں' مروجہ پیداواری رشتوں سے تصادم میں آ جاتی ہیں۔ یہ رشتے' پیداواری قوتوں کو آگے بڑھانے کی بجائے ان کے پیروں کی بیڑیاں بن جاتے ہیں۔ تبھی ایک سماجی انقلاب کا عمل شروع ہوتا ہے۔ معاشی بنیاد میں آنے والی تبدیلیاں جلد یا بدیر سارے دیوہیکل (سیاسی و قانونی) بالائی ڈھانچے کی تبدیلی پر منتج ہوتی ہیں... کوئی بھی سماجی نظام اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک کہ وہ تمام پیداواری قوتیں ترقی نہیں پا جاتیں جن کی گنجائش اس میں موجود ہوتی ہے اور نئے اعلیٰ پیداواری رشتے بھی اس وقت تک پرانے والوں کی جگہ نہیں لے سکتے جب تک کہ ان کے وجود کے مادی حالات پرانے سماج کی کوکھ میں پک کر تیار نہیں ہو جاتے۔ یوں انسان ناگزیر طور پر انہی مسائل سے الجھتا ہے جنہیں حل کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ کوئی بھی مسئلہ اسی وقت ابھرتا ہے جب اس کے حل کے مادی حالات پیدا ہو چکے ہوتے ہیں یا پیدا ہونے کے مرحلے میں ہوتے ہیں۔ وسیع تر خطوط پر دیکھا جائے تو ایشیائی، قدیم، جاگیردارانہ اور جدید

بورژوا طرز ہائے پیداوار کو سماج کے معاشی ارتقا کی غمازی کرنے والے مراحل قرار دیا جا سکتا ہے۔'' (کارل مارکس، سیاسی معاشیات کا تنقیدی جائزہ، 1859ء)

استحصال (Exploitation)

استحصال سے مراد انسانی محنت کی چوری ہے۔ یعنی جب محنت کش کو اس کی محنت کی پیداوار سے کم ملتا ہے اور باقی کی پیداوار وہ فرد یا افراد لے جاتے ہیں جن کے لئے محنت کش کام کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

طبقہ (Class)

کوئی طبقہ ایسے افراد پر مشتمل ہوتا ہے جن کا ذرائع پیداوار اور محنت سے رشتہ مشترک ہوتا ہے۔ ایک طبقاتی سماج دو بنیادی طبقات میں تقسیم ہوتا ہے: 1) استحصالی طبقہ 2) استحصال زدہ طبقہ۔ استحصالی طبقہ ذرائع پیداوار پر قابض ہوتا ہے جبکہ استحصال زدہ طبقہ، جو محنت کش طبقہ بھی ہوتا ہے، ذرائع پیداوار کی ملکیت نہیں رکھتا اور استحصالی طبقے کے لئے کام کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

ظلم، جبر اور ڈاکہ زنی ہمیشہ واضح نظر آتے ہیں۔ اِس کے برعکس استحصال کی نوعیت خاموش اور پوشیدہ ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ استحصال زدہ طبقات ہمیشہ اپنے استحصال سے واقف اور باخبر ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ استحصال سے باخبر ہوں لیکن اِسے 'فطری' یا مقدر کا لکھا سمجھتے ہوں۔ اِسی طرح استحصالی طبقات بھی استحصال کے وجود سے انکاری ہوتے ہیں یا مختلف تاویلات کے ذریعے اسے اپنا حق قرار دیتے ہیں۔ اِن دو طبقات کے علاوہ ایک طبقاتی سماج میں درمیانے طبقات بھی موجود ہو سکتے ہیں جن کا کردار دونوں طبقات کے بین بین ہوتا ہے لیکن غیر معمولی حالات ان کی مختلف پرتوں کو بھی طبقاتی بنیادوں پر تقسیم اور صف آرا کر دیتے ہیں۔

مروجہ سماجی سائنس میں طبقات کی تعریف عام طور پر آمدن، کلچر، عادات و اقدار اور کھپت وغیرہ کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ یہ درحقیقت غیر سائنسی طریقہ کار ہے۔ مندرجہ بالا خاصیتوں کا انحصار طبقے پر ہوتا ہے، نہ کہ اِن خاصیتوں سے طبقات کا تعین ہوتا ہے۔ اِسی طرح کسی طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک فرد اور بحیثیت مجموعی اُس طبقے کا کردار مختلف ہو سکتا ہے۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جب افراد اپنے طبقے کو چھوڑ کر متحارب طبقات سے جا ملتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی عمومی اصول نہیں بلکہ استثنا ہے۔

طبقاتی جدوجہد(Class Struggle)

طبقاتی جدوجہد سے مراد دو متضاد مفادات رکھنے والے طبقات کے درمیان کشمکش اور تصادم ہے۔طبقاتی سماج کی تمام تر تاریخ طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے۔ایک طبقاتی سماج میں طبقاتی تضادات ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔کبھی سطح کے نیچے پکتے رہتے ہیں اور بظاہر نظر نہیں آتے تو کبھی بھڑک کر طبقاتی تصادم اور جنگ کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔مزید برآں طبقاتی جدوجہد کئی شکلیں اختیار کر سکتی ہے مثلاً معاشی، سیاسی، نظریاتی۔تاہم یہ تمام شکلیں ایک دوسرے سے متصل اور مربوط ہوتی ہیں۔

کیا طبقات ہمیشہ سے موجود رہے ہیں؟

نہیں۔انسانی سماج ہمیشہ سے طبقات میں تقسیم نہیں رہا ہے۔انسان کو اپنی موجودہ جسمانی شکل میں ارتقا پذیر ہوئے تقریباً دو لاکھ سال ہوئے ہیں (اگرچہ 33 لاکھ سال پرانے پتھر کے اوزار بھی دریافت ہوئے ہیں)۔لیکن طبقات کا وجود پچھلے آٹھ سے دس ہزار سال کے دوران ہی نظر آتا ہے۔بعض سماجوں میں تو اس سے بھی بہت بعد تک طبقات نمودار نہیں ہوئے۔یوں انسانی تاریخ کا بیشتر حصہ طبقات سے پاک رہا ہے۔اِس قدیم غیر طبقاتی سماج کو 'قدیم اشتراکیت' بھی کہا جاتا ہے۔

قدیم اشتراکی سماج(Primitive Communism)

قدیم اشتراکی سماج میں ذرائع پیداوار (جو بالکل ابتدائی اور پسماندہ شکلوں میں تھے) کی نجی ملکیت کا تصور موجود نہ تھا۔اگر کہیں نجی ملکیت ذاتی اوزاروں کی حد تک موجود بھی تھی تو عدم مساوات سے بچنے کے لئے موت کے بعد انہیں ان کے مالک کے جسم کے ساتھ ہی جلا یا دفن کر دیا جاتا تھا۔سماجی رشتے مساوات پر مبنی تھے یعنی پیداوار پر سب کا حق مساوی تھا۔خوراک کے حصول کے لئے قبیلے کے تمام صحت مند افراد جانوروں کے شکار یا جنگلی پھل اور سبزیاں اکٹھی کرنے کے عمل میں شریک ہوتے تھے۔

محنت کی تقسیم صرف مردوں اور عورتوں کے درمیان تھی جس کی وجوہات خالصتاً فطری تھیں۔ مرد شکار پر جایا کرتے تھے تو عورتیں چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں اور سبزیاں، پھل وغیرہ

جمع کرتی تھیں۔ بعض صورتوں میں خوراک کی فراہمی میں عورت کا کردار مرد کی نسبت زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ ان معاشروں میں عورت کو اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ انہوں نے کئی قسم کی مہارتیں حاصل کر لی تھیں۔ ظروف سازی کے بارے میں قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ عورتوں کی ایجاد تھی۔ اِسی طرح زراعت کی دریافت میں عورتوں نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

اِن اشتراکی معاشروں میں پیداوار کی تقسیم افراد کی ضروریات کے مطابق کی جاتی تھی۔ قبیلے کے معذور افراد، بزرگوں اور بچوں وغیرہ کی نگہداشت سب کی مشترکہ ذمہ داری تھی۔ فوری ضرورت سے زائد پیداوار نہیں تھی اور جو کچھ پیدا ہوتا تھا وہ فوراً استعمال ہو جاتا تھا۔ لٰہذا یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ اِس زائد پیداوار پر کس کا تصرف ہوگا۔ قبیلے کے فیصلوں میں تجربہ کار بڑے بوڑھوں کا کردار یقیناً اہم ہوتا تھا لیکن یہ لوگ حکمران یا بادشاہ ہرگز نہیں تھے۔ بلکہ ان کی عملداری کی بنیاد اخلاقی تھی۔ ان کی عملداری نہ مانے جانے کی صورت میں بھی کوئی جبر یا دھونس نہیں تھی۔

اِس سماج کے بارے میں فریڈرک اینگلز اپنی کتاب 'خاندان، نجی ملکیت اور ریاست کا آغاز' میں لکھتا ہے: ''ہر کام نہایت حسن وخوبی کیساتھ انجام پاتا ہے جس کے لئے نہ پولیس کے کسی سپاہی کی ضرورت ہے، نہ فوج کی۔ نہ وہاں بادشاہ اور امرا ہیں، نہ کوئی گورنر اور منصف وغیرہ، نہ وہاں مقدمے چلتے ہیں اور نہ کسی کو قید کی سزا دی جاتی ہے۔ سارے اختلافات اور جھگڑے وہ سب لوگ آپس میں مل کر طے کر لیتے ہیں... امورِ خانہ داری متعدد خاندانوں کے لوگ مل کر اشتراکی انداز سے چلاتے ہیں۔ زمین قبیلے کی ملکیت ہوتی ہے... ہماری طرح نظم ونسق کی ایک وسیع اور پیچیدہ مشینری کا وہاں کوئی وجود نہیں۔ جن لوگوں کو کسی معاملے سے تعلق ہوتا ہے وہ اس کو طے کر لیتے ہیں اور زیادہ تر حال یہ ہے کہ صدیوں پرانے رسم ورواج نے پہلے ہی سب کچھ طے کر کے رکھ دیا ہے۔ وہاں کوئی مفلس اور محتاج نہیں ہو سکتا کیونکہ اشتراکی گھرانے بزرگوں، مریضوں اور جنگ کے اپاہجوں کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری کا پورا احساس رکھتے ہیں۔ سب آزاد اور برابر ہیں اور اس میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ اس وقت تک غلامی کا کہیں کوئی گزر نہیں ہے... ایسا سماج کس طرح کے مردوں اور عورتوں کو جنم دیتا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ گورے جو ایسے انڈینوں (Indians) سے مل سکے تھے جو ان کے اثر سے خراب نہیں ہو پائے تھے، وہ سب ان

کی خودداری اور وقارِ نفس، ان کی صاف گوئی، ان کے کردار کی مضبوطی اور ان کی دلیری کے مداح تھے... یہ تھا انسان اور انسانی سماج طبقاتی تقسیم سے پہلے...''

تاہم ایسے قدیم سماجوں کی حالت زیادہ تر دلکش نہیں ہوتی تھی۔ پیداواری قوتیں انتہائی پسماندہ تھیں۔ بعض اوقات خوراک کی انتہائی قلت پیدا ہو جاتی تھی۔ خشک سالی اور سیلابوں سے قحط بھی پیدا ہو جاتے تھے۔ موسم اور بیماریوں کے خلاف مدافعت کے وسائل انتہائی محدود تھے۔ بالخصوص بچوں میں شرح اموات آج کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ فطرت کے خلاف جدوجہد انتہائی کٹھن اور تلخ تھی۔ تاہم انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال اور جبر موجود نہیں تھا۔ افریقہ، جنوبی امریکہ اور ہندوستان کے دور دراز علاقوں اور جزائر پر قدیم اشتراکی معاشروں کی مختلف شکلیں آج بھی موجود ہیں۔

سماج کی طبقات میں تقسیم

تقریباً 12 ہزار سال پہلے زراعت، یعنی جانوروں کو سدھانے اور کاشت کاری کا آغاز انسانی سماجوں میں گہری معاشی و سماجی تبدیلیوں کا موجب بنا۔ اِس عمل کو بحیثیت مجموعی 'Neolithic Revolution' بھی کہا جاتا ہے جو انسانی تاریخ کا پہلا عظیم انقلاب تھا اور پیداواری قوتوں میں بڑی جست کی غمازی کرتا تھا، چنانچہ جلد یا بدیر نئے پیداواری رشتوں کا جنم بھی ناگزیر تھا۔ اناج کو چنا اور بویا جانے لگا، جانوروں کی مدد سے ہل چلایا جانے لگا۔ وقت کے ساتھ انسان زیادہ سے زیادہ جانوروں کا استعمال اور پودوں کی کاشت کاری سیکھتا چلا گیا۔ زراعت نے خانہ بدوشی کا خاتمہ کیا، مستقبل بستیاں آباد ہوئیں، انسانی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا اور پہلی بار آبادی کی فوری ضرورت سے زیادہ پیداوار ہوئی۔ اِس زائد پیداوار پر تصرف کا سوال ہی طبقاتی تقسیم کی بنیاد بنا۔ پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ کچھ لوگ کام کرنے کی اہلیت رکھنے کے باوجود کچھ کیے بنا بھی اِس زائد پیداوار پر زندگی گزار سکتے تھے۔ لیکن پیداواری قوتیں اِتنی ترقی یافتہ نہیں تھیں کہ ہر کوئی جسمانی مشقت سے آزادی کی اِس عیاشی سے فیض یاب ہو سکتا۔ یہی وہ بنیاد تھی جس پر طبقاتی معاشرہ قائم ہوا۔

''جب تک مجموعی سماجی محنت اتنی پیداوار کرتی ہے جو تمام لوگوں کی ضروریات کو بمشکل پورا

کرنے سے تھوڑی سی زیادہ ہوتی ہے، تب تک سماج کے اراکین کی اکثریت کو تمام وقت یا تقریباً تمام وقت کام کرنا پڑتا ہے، تب تک یہ سماج ضرورت کے تحت طبقات میں تقسیم رہتا ہے۔ محنت کرنے والی وسیع اکثریت کے ساتھ ساتھ ایک طبقہ ابھرتا ہے جو براہِ راست پیداواری محنت سے آزاد ہوتا ہے اور سماج کے عمومی معاملات سنبھالتا ہے۔ یوں (سماج کی) طبقات میں تقسیم میں محنت کی تقسیم کا قانون کارفرما ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ طبقاتی تقسیم تشدد، ڈاکہ زنی، عیاری اور مکاری کے ذریعے عمل میں نہیں آتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک بار بالادست مقام حاصل کر لینے اور محنت کش طبقے کی قیمت پر اپنے اقتدار کو مستحکم کر لینے کے بعد حکمران طبقہ اپنے سماجی اقتدار کو عوام کے استحصال میں نہیں بدلتا ہے۔'' (فریڈرک اینگلز، اینٹی ڈیورنگ، 1877ء)

لیکن یہ واضح رہنا چاہئے کہ غیر طبقاتی سے طبقاتی سماج میں یہ تبدیلی راتوں رات مکمل نہیں ہوگئی بلکہ اِس میں ہمیں سینکڑوں، حتیٰ کہ ہزاروں برسوں پر مبنی عبوری شکلیں مل سکتی ہیں۔ بہر حال نئے ابھرنے والے حکمران طبقے کو اپنی مراعات اور ملکیت کی حفاظت اور محنت کش طبقے کو دبانے کے لئے طاقت کی ضرورت تھی۔ منظّم جبر کی اِسی ضرورت نے ریاست کو جنم دیا۔ مزید برآں زراعت، جو عورت کی ہی دریافت تھی، نے عورت کو تاریخی پسپائی سے دو چار کیا۔ کھینچائی کے جانوروں کی مدد سے ہل چلانا بنیادی طور پر مردوں کا کام تھا۔ اس سے عورت مجبور ہوگئی کہ مرد کے فراہم کردہ خام مال پر ہی کام کرے۔ یوں وہ پیداوار میں براہِ راست کردار سے محروم ہوگئی۔ قدیم اشتراکی سماج میں وراثت اگرچہ غیر اہم تھی، لیکن نسب عورت کی نسبت سے چلتا تھا۔ اب وراثت کا سوال پیدا ہو چکا تھا۔ یوں مرد کی نسبت سے وراثت چلنے لگی۔

اگر تاریخ کو اخلاقیات اور جذبات سے ہٹ کر سائنسی بنیادوں پر پرکھا جائے تو تمام تر جبر و استحصال کے باوجود غیر طبقاتی سے طبقاتی سماج میں تبدیلی ایک ترقی پسندانہ قدم تھا۔ اِس سے پیداواری قوتوں کو ترقی ملی اور تاریخ میں پہلی بار ایک ایسا مراعت یافتہ طبقہ وجود میں آیا جو جسمانی مشقت سے آزاد ہو کر سوچنے اور کائنات پر غور و فکر کرنے کا کام کر سکتا تھا۔ یوں فلسفے، سائنس اور فنونِ لطیفہ کی ترقی کا آغاز ہوا۔ لیکن مراعت یافتہ طبقات کی یہ 'فراغت' لاکھوں کروڑوں گمنام انسانوں کی محنت کے بغیر ممکن نہ تھی۔ ہیگل نے اِسی تناظر میں کہا تھا کہ انسان

غلامی سے نہیں بلکہ غلامی کے ذریعے آزادی حاصل کرتا ہے۔

تاریخ میں کون کون سے طبقاتی سماج ملتے ہیں؟

تاریخ میں کئی طرح کے طبقاتی سماج نظر آتے ہیں جنہیں مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

1) غلام داری: غلام دارانہ سماج بڑے پیمانے پر غلاموں کے استحصال پر قائم تھا۔ یہ غلام عام طور پر جنگوں یا دور دراز پسماندہ قبائل پر کئے جانے والے حملوں میں ہاتھ آنے والے قیدی ہوتے تھے، آقاؤں کی ملکیت تصور ہوتے تھے اور انسان نہیں سمجھے جاتے تھے۔ غلاموں کی خرید و فروخت عام تھی۔ اِس سماج کا بنیادی طبقاتی تضاد انسانوں کی آقاؤں اور غلاموں کے درمیان تقسیم پر مبنی تھا۔ کلاسیکی غلام داری کی مثالیں قدیم یونان اور روم میں ملتی ہیں۔

2) جاگیرداری: جاگیردارانہ سماج مزارعوں کے جاگیرداروں کے ہاتھوں استحصال پر مبنی تھا۔ تاہم غلاموں کے برعکس مزارعے اگرچہ کمتر ہی سہی لیکن انسان تصور کئے جاتے تھے۔ یہ مزارعے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر کام کرتے تھے اور باقی کا سارا وقت جاگیردار کی زمین پر بیگار میں محنت کرنے پر مجبور تھے۔ جاگیرداری اپنی کلاسیکی شکل میں قرونِ وسطیٰ (پانچویں سے پندرہویں صدی عیسوی) کے یورپ میں ملتی ہے۔

3) سرمایہ داری: آج ہم ایک سرمایہ دارانہ سماج میں زندہ ہیں اور یہی طرزِ پیداوار کم و بیش پوری دنیا میں رائج ہے۔ ماضی کے طبقاتی سماجوں کی طرح اِس سماج میں بھی ذرائع پیداوار ایک اقلیتی حکمران طبقے کی ملکیت میں ہیں جسے سرمایہ دار طبقہ یا 'بورژوازی' کہا جاتا ہے۔ آبادی کی اکثریت محنت کش مرد و خواتین (پرولتاریہ) پر مشتمل ہے جنہیں زندہ رہنے کے لئے اپنی قوت محنت سرمایہ داروں کو بیچنی پڑتی ہے۔

ایشیائی طرز پیداوار (Asiatic Mode of Production)

سماج کی مندرجہ بالا شکلیں کلاسیکی طور پر یورپی خطوں کے لئے مخصوص رہی ہیں۔ لیکن مشرقی خطوں (بالخصوص فارس، ہندوستان، چین وغیرہ) میں ہمیں سماجی ارتقا کی ایک مختلف روش نظر آتی ہے جسے مارکس نے 'ایشیائی طرزِ پیداوار' یا 'مشرقی استبداد' (Oriental Despotism) کا نام دیا تھا۔ مثلاً برصغیر میں غلام داری بطور طرزِ پیداوار کبھی بھی موجود نہیں رہی اور جاگیرداری اور

سرمایہ داری کو بھی انگریز نو آبادکاروں نے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں پیوند کیا۔ یوں یہاں کے سماجوں کا طرزِ ارتقا یورپ سے یکسر مختلف تھا۔ کارل مارکس نے 1853ء تا 1858ء نیو یارک ٹربیون میں ہندوستان پر اپنے مشہور مضامین میں 'ایشیائی طرز پیداوار' پر کافی روشنی ڈالی۔ اِن تحریروں کی روشنی میں ایشیائی طرز پیداوار کا مختصر خاکہ یوں تیار کیا جا سکتا ہے:

1۔ زراعت اور دستکاری پر مبنی معیشت، جس میں محنت کی واضح تقسیم موجود تھی۔

2۔ زمین کی اشتراکی ملکیت۔

3۔ ریاست کی جانب سے تعمیراتِ عامہ (پبلک ورکس) جو زیادہ تر زراعت سے متعلقہ ہوتی تھیں اور آب پاشی کے لئے نہروں کے وسیع نظام تعمیر کئے جاتے تھے۔

4۔ مطلق العنانیت پر مبنی ریاست جس کا انتظام وسیع بیوروکریسی چلاتی تھی۔

5۔ دیہاتوں سے ٹیکس یا لگان کی وصولی کے ذریعے استحصال

ایشیائی طرز پیداوار پر مبنی ریاست اپنی ساخت میں مغرب سے یکسر مختلف تھی۔ مغرب میں غلام داری یا جاگیرداری ادوار میں تشکیل پانے والی ریاست کی بنیاد نجی ملکیت پر تھی جبکہ ایشیائی طرز پیداوار میں نجی ملکیت وجود نہیں رکھتی تھی۔ جیسے مارکس نے لکھا کہ اکثر ایشیائی ممالک کی طرح ہندوستان میں زمین کی اصل مالک حکومت ہی ہوتی تھی۔ یہاں پر فرد کے پاس زمین کی نجی ملکیت موجود نہ تھی تاہم زمین کا تصرف موجود تھا۔ یعنی کوئی بھی فرد دیہاتی کمیون کی مرضی سے زمین کو کاشتکاری وغیرہ کے لئے استعمال میں تو لا سکتا تھا لیکن یہ اُس کی نجی ملکیت نہیں ہوتی تھی۔ مارکس نے 'Grundrisse' میں لکھا، ''ملکیت صرف اشتراکی ملکیت کے طور پر موجود ہے... کوئی بھی فرد زمین کو محض کمیون کے ایک رکن کے طور پر بروئے کار لا سکتا ہے... ملکیت سماجی اور تصرف انفرادی ہے۔'' اِسی طرح مارکس نے اپنے مضمون 'لارڈ کیننگ کا اعلان اور ہندوستان میں زمین کی ملکیت' میں ہندوستانی دیہاتوں کے بارے میں لکھا، ''زمین دیہاتی اداروں کی ملکیت تھی جنہیں یہ اختیار حاصل تھا کہ کاشت کے لئے اسے افراد کو الاٹ کریں۔ زمیندار اور تعلق دار سرکاری افسروں کے علاوہ اور کچھ نہ تھے جو اس لئے مقرر کئے جاتے تھے کہ گاؤں کے ذمے جو لگان ہے اسے جمع کریں اور راجہ کو ادا کر دیں۔''

مغربی سماجوں میں غلام یا مزارعے کی پیدا کردہ قدر زائد پر انفرادی آقا یا جاگیردار براہ راست قابض ہوتا تھا جبکہ ایشیائی سماجوں میں ریاست پوری آبادی کی اجتماعی پیداوار میں سے قدر زائد نچوڑتی تھی۔ اِسی قدر زائد میں سے ریاستی اہلکاروں کو اجرتیں دی جاتی تھیں۔ دیہات بڑی حد تک خود کفیل اور ایک دوسرے سے کٹے ہوئے تھے۔ مختلف حملہ آور آتے رہے اور بالائی سطح پر حکمران بدلتے رہے لیکن نیچے سے اِس طرزِ پیداوار میں کئی ہزار سال تک کوئی تبدیلی نہیں آئی اور دیہاتوں کی زندگی ایک یکسانیت کا شکار رہی۔ چند بڑے شہروں کو چھوڑ کر دیہاتوں نے اپنے اندر چھوٹی سی دنیا بسا رکھی تھی۔ پیسے اور منڈی کا کردار انتہائی محدود اور سطحی تھا۔ پیشہ وارانہ مہارتیں نسل در نسل خاندانوں میں چلتی تھیں اور انہی پیشوں کے ناموں سے ذات برادری کی باقیات یہاں آج تک نظر آتی ہیں۔ مغرب نے جس عرصے میں سرمایہ داری تک کا سفر طے کیا اس دوران یہ ایشیائی خطے ٹھہراؤ کا شکار رہے۔ آخر کار ہزاروں سالوں پر مبنی اِس جمود کو انگریز نوآبادکاروں نے توڑا اور ایشیائی طرز پیداوار کی بنیادوں کو تہس نہس کر دیا۔ لیکن نوآبادیاتی لوٹ مار اور استحصال کے اِسی عمل میں یہاں جدید صنعت، ٹرانسپورٹ اور ذرائع ابلاغ کی بنیاد بھی رکھی جس سے پرولتاریہ کا جنم ہوا، بیرونی دنیا سے روابط استوار ہوئے اور ہزاروں سالوں تک الگ تھلگ رہنے والے علاقے قریب آ گئے۔

ریاست (State)

ریاست ایک منظّم جبر کا ادارہ ہے جسے حکمران طبقہ اپنی حاکمیت کو قائم رکھنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ ریاست کوئی 'فطری' ادارہ ہے نہ ہی اس کا وجود ازل سے تھا بلکہ سماج کے طبقات میں تقسیم ہونے کے ساتھ ہی ریاست کی ضرورت پیدا ہوئی۔

''ریاست طبقاتی تضادات کے ناقابلِ مصالحت ہونے کی پیداوار اور اظہار ہے۔ ریاست تبھی ابھرتی ہے جب طبقاتی تضاد معروضی طور پر حل نہیں ہو سکتا اور یوں ریاست کا وجود ثابت کرتا ہے کہ طبقاتی تضادات ناقابلِ مصالحت ہیں۔'' (لینن، ریاست اور انقلاب، 1917ء)

''ریاست ایسی طاقت ہے جو سماج سے پیدا ہوئی ہے لیکن اپنے کو اس سے بالاتر رکھتی ہے اور اس سے زیادہ سے زیادہ بیگانہ ہوتی جاتی ہے۔ یہ طاقت خاص طور سے کس پر مشتمل ہے؟ یہ مسلح افراد کے مخصوص جتھوں پر مشتمل ہے جن کے زیر حکم جیل وغیرہ ہیں۔'' (ایضاً)

''ہر انقلاب ریاست کی مشینری کو تباہ کر کے ہمیں عریاں طبقاتی جدوجہد دکھاتا ہے، صاف طور پر یہ دکھاتا ہے کہ حکمران طبقہ کس طرح مسلح لوگوں کے مخصوص دستوں کو بحال کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کی خدمت کرتے ہیں اور کیسے مظلوم طبقہ اس قسم کی نئی تنظیم بنانے کی کوشش کرتا ہے جو استحصال کرنے والوں کے بجائے استحصال زدہ لوگوں کی خدمت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔'' (ایضاً)

سامراجیت (Imperialism)

''سامراجیت' سرمایہ داری کے ارتقا کا وہ مرحلہ ہے جس میں اجارہ داریوں اور مالیاتی سرمائے کا غلبہ قائم ہو چکا ہے، سرمائے کی برآمد (یعنی دوسرے ملکوں میں سرمایہ کاری) واضح اہمیت حاصل کر چکی ہے، بین الاقوامی ٹرسٹوں کے مابین دنیا کی تقسیم شروع ہو چکی ہے اور بڑی سرمایہ دارانہ طاقتوں کے درمیان دنیا کے تمام علاقوں کی تقسیم مکمل ہو چکی ہے۔'' (ولادیمیر لینن، سامراجیت: سرمایہ داری کی بلند ترین منزل، 1916ء)

''یہ مرحلہ کارخانہ داروں کے درمیان پرانے آزاد مقابلے سے بالکل مختلف ہے جو بکھرے ہوئے اور ایک دوسرے سے لاتعلق ہوتے تھے اور ایک انجانی منڈی کے لئے مصنوعات تیار کرتے تھے۔ (سرمائے کا) ارتکاز ایسے نقطے پر پہنچ گیا ہے جہاں کسی ملک کی، کئی ملکوں کی یا ساری دنیا کی خام اشیا کے تمام وسائل کا تقریباً تخمینہ لگانا ممکن ہے (مثلاً خام لوہے کے ذخیروں کا)۔ نہ صرف ایسے تخمینے لگائے جاتے ہیں بلکہ ان وسائل پر زبردست اجارہ دار کمپنیاں قبضہ جما رہی ہیں۔ منڈیوں کی گنجائش کا بھی تقریباً تخمینہ لگایا جاتا ہے اور پھر کمپنیاں ان کو معاہدے کے ذریعے آپس میں ''تقسیم'' کر لیتی ہیں۔ ہنرمند محنت کو اجارہ داری میں لیا جاتا ہے، بہترین انجینئر ملازم رکھے جاتے ہیں، ٹرانسپورٹ کے ذرائع پر تسلط حاصل کیا جاتا ہے۔ مثلاً امریکہ میں ریلوے، یورپ اور امریکہ میں جہازراں کمپنیاں۔ سرمایہ داری اپنی سامراجی منزل میں پیداوار کی انتہائی ہمہ گیر سماج کاری (Socialization) کی طرف براہ راست جاتی ہے۔ یہ کہنا چاہیے کہ وہ سرمایہ داروں کو ان کی مرضی اور شعور کے خلاف ایک قسم کے نئے سماجی نظام کی طرف کھینچتی ہے جو مکمل آزاد مقابلے سے مکمل سماج کاری تک عبوری ہوتا ہے۔'' (ایضاً)

''پیداوار کا عمل سماجی ہوتا ہے لیکن اس پر قبضہ نجی رہتا ہے۔ پیداوار کے سماجی ذرائع چند لوگوں

کی نجی ملکیت رہتے ہیں۔رسمی طور پر تسلیم شدہ آزاد مقابلے کا عام ڈھانچہ باقی رہتا ہے اور چند اجارہ داروں کا باقی آبادی پر طوق سو گنا زیادہ بھاری، اجیرن اور نا قابل برداشت ہو جاتا ہے۔" (ایضاً)

پرولتاریہ (Proletariat)

پرولتاریہ جدید سرمایہ دارانہ سماج کا محنت کش طبقہ ہے جو ذرائع پیداوار کی ملکیت سے محروم اور اپنی بقا کے لئے اپنی قوت محنت سرمایہ داروں کو بیچنے پر مجبور ہے۔

غلام ایک ہی مرتبہ ہمیشہ کیلئے فروخت کر دیا جاتا ہے۔لیکن پرولتاریہ کو اپنے آپ کو دنوں یا گھنٹوں کے حساب سے بیچنا پڑتا ہے۔غلام اپنے آقا کی ملکیت ہوتا ہے۔اُس کی زندگی کتنی ہی بدحال کیوں نہ ہو، یقینی ہوتی ہے۔ کیونکہ اسے زندہ رکھنے میں ہی آقا کا فائدہ ہوتا ہے۔لیکن انفرادی طور پر ایک پرولتاری کو اپنی بقا کی کوئی ضمانت حاصل نہیں ہوتی۔ایک طبقے کے طور پر ہی پرولتاریہ کی بقا یقینی ہوتی ہے۔غلام کو کسی مقابلہ بازی کا سامنا نہیں ہوتا جبکہ پرولتاریہ کو مقابلہ بازی کے تمام تر انتشار کا شکار ہونا پڑتا ہے۔غلام نجی ملکیت کے تمام رشتوں میں سے صرف غلامی کے رشتے کو مٹا کر ہی خود کو آزاد کر سکتا ہے اور پرولتاری بن سکتا ہے۔لیکن پرولتاری نجی ملکیت کا مکمل خاتمہ کر کے ہی آزادی حاصل کر سکتا ہے۔

اسی طرح جاگیرداری میں مزارعے کے پاس ذریعہ پیداوار، یعنی زمین کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔ اس کے بدلے میں وہ اپنی پیداوار یا خدمات کا ایک حصہ جاگیردار کو دینے کا پابند ہوتا ہے۔لیکن پرولتاریہ جن ذرائع پیداوار پر کام کرتا ہے وہ کسی دوسرے کی ملکیت ہوتے ہیں اور اُسے اجرت کی شکل میں اپنی پیداوار کا ایک حصہ ملتا ہے۔مزارع دیتا ہے، پرولتاریہ لیتا ہے۔مزارعے کی بقا یقینی ہوتی ہے، پرولتاریہ کی نہیں ہوتی۔مزارع مقابلے کی دوڑ سے باہر ہوتا ہے، پرولتاریہ اِس دوڑ میں شامل ہوتا۔مزارع کسی نہ کسی طریقے سے مالکان کے طبقے میں شامل اور مقابلے کی دوڑ میں داخل ہو کر خود کو آزاد کروا سکتا ہے۔لیکن پرولتاری مقابلہ بازی، نجی ملکیت اور تمام طبقاتی تضادات کو مٹا کر ہی آزاد ہو سکتا ہے۔

پرولتاریہ کا جنم کیسے ہوا؟

پرولتاریہ نے اس صنعتی انقلاب میں جنم لیا جو 18 ویں صدی کے وسط میں برطانیہ میں رونما

ہوا اور جو اس کے بعد سے دنیا کے دوسرے متمدن ممالک میں دہرایا جاچکا ہے۔ بھاپ کے انجن کی ایجاد، سپننگ مشین، پاور لوم اور دوسری کئی مشینیں اِس صنعتی انقلاب کا پیش خیمہ بنیں۔ یہ مشینیں بہت مہنگی تھیں اور صرف سرمایہ دار ہی انہیں خرید سکتے تھے۔ ان ایجادات نے سارا طرز پیداوار ہی بدل دیا اور دستکاری سے وابستہ مزدوروں کو فارغ کر دیا کیونکہ یہ مشینیں اُن کے سست رفتار چرخوں اور کھڈیوں کے مقابلے میں زیادہ سستی اور بہتر اجناس پیدا کر سکتی تھیں۔ یوں مشینوں نے ساری صنعت کو بڑے سرمایہ داروں کے قبضے میں دے دیا اور مزدوروں کے آلات کو بالکل ہی بے وقعت بنا دیا۔ نتیجتاً جلد ہی سب کچھ سرمایہ داروں کے پاس تھا اور مزدوروں کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

پیداواری عمل میں جدید مشینری کے متعارف ہونے سے محنت مختلف مزدوروں میں زیادہ سے زیادہ تقسیم ہوگئی اور جو مزدور پہلے کوئی چیز مکمل تیار کرتا تھا اب اُس کا محض ایک حصہ ہی تیار کرنے لگا۔ محنت کی اِس تقسیم نے چیزوں کی تیز اور سستی پیداوار کو ممکن بنایا۔ اس سے انفرادی مزدور کی سرگرمی نہایت سادہ اور مسلسل دہرائی جانے والی میکانکی حرکات تک محدود ہو کر رہ گئی جسے مشین من وعن بلکہ زیادہ بہتر انداز میں سرانجام دے سکتی تھی۔ آج متمدن ممالک میں تقریباً تمام طرح کی محنت فیکٹریوں میں کی جاتی ہے اور کام کے تقریباً تمام شعبوں میں دستکاری متروک ہو چکی ہے۔ اِس عمل نے پرانے درمیانے طبقے، بالخصوص چھوٹے دستکاروں کو تباہ کر دیا ہے اور مزدوروں کے حالات یکسر بدل دیئے ہیں۔ یوں دو نئے طبقات پیدا ہوئے ہیں جو رفتہ رفتہ دوسرے تمام طبقات کو نگل رہے ہیں: 1) ذرائع پیداوار کی ملکیت رکھنے والے سرمایہ دار 2) اپنی قوت محنت سرمایہ داروں کو بیچنے پر مجبور پرولتاری

پیٹی بورژوازی (Petty Bourgeoisie)

اِن دونوں بنیادی طبقات کے درمیان چھوٹے مالکان پر مشتمل ایک تیسرا 'پیٹی بورژوا' طبقہ بھی ہوتا ہے۔ مثلاً چھوٹے دکاندار اور کاروباری لوگ وغیرہ۔ لیکن جوں جوں سرمایہ داری آگے بڑھتی ہے یہ طبقہ سکڑتا جاتا ہے کیونکہ بڑا سرمایہ چھوٹے سرمائے کو نگلتا چلا جاتا ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ پاکستان میں پچھلے چند سالوں سے بڑے بڑے شاپنگ مال اور 'سپر سٹور' کس طرح سے چھوٹے دکانداروں اور تاجروں کا صفایا کر رہے ہیں۔ آج انتہائی ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک

میں اِس طبقے کی غیر مستحکم باقیات ہی نظر آتی ہیں۔ اِسی طرح سرمایہ داروں کے اداروں کی مینجمنٹ چلانے والوں کو بھی 'پیٹی بورژوازی' میں شمار کیا جاسکتا ہے کیونکہ ایک طرف تو وہ خود سرمایہ دار سے ملنے والی اجرت پر منحصر ہوتے ہیں لیکن اُن کا کام مزدوروں کے زیادہ سے زیادہ استحصال کو یقینی بنانا ہوتا ہے۔ سرمایہ داری کے وظیفہ خوار دانشوروں، صحافیوں اور مفکروں کا کردار بھی یہی ہوتا ہے۔ وسیع تناظر میں بات کی جائے تو سماج کی نسبتاً مراعت یافتہ درمیانی پرتوں کو پیٹی بورژوازی میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

سرمایہ دارانہ سماج میں یہ طبقہ مسلسل اضطراب کا شکار رہتا ہے۔ اپنا معیارِ زندگی نچلے طبقات تک گر جانے کے خوف اور اپنے سے بالا طبقات میں شامل ہونے کے خبط میں مبتلا رہتا ہے۔ یوں اس طبقے کی نفسیات میں محنت کشوں سے نفرت، 'انفرادیت'، کیریئر ازم، خود پسندی اور خودنمائی کے رجحانات پائے جاتے ہیں۔ یہ حکمران طبقات سے حسد اور نفرت بھی کرتا ہے اور اُن جیسا بننے کی کوشش میں ان کی اقدار، ریت رواج، ثقافت اور اخلاقیات کو بھی اپناتا ہے اور محنت کش طبقے پر بھی مسلط کرتا ہے۔ سیاسی طور پر یہ طبقہ اس لحاظ سے بانجھ ہوتا ہے کہ اس کا اپنا کوئی طبقاتی نظریہ نہیں ہوتا۔ یہ طبقہ طاقت سے بہت مرعوب ہوتا ہے۔ بورژوازی اور پرولتاریہ کے درمیان بھرپور طبقاتی کشمکش کے ادوار میں پیٹی بورژوازی کی زیادہ تر پرتیں بالعموم اُسی طبقے کی پیروی کرتی ہیں جس کا پلڑا بھاری ہوتا ہے۔ یوں انقلابی ادوار میں طاقتوں کے بدلتے ہوئے توازن کیساتھ یہ مسلسل دائیں بائیں جھولتا رہتا ہے۔ محنت کش طبقہ اپنی قیادت کی نظریاتی کمزوری یا غداری کی وجہ سے انقلاب کو منطقی انجام تک پہنچانے کے قابل نہ ہو تو پسپائی کے ادوار میں پیٹی بورژوازی ایسے شخصیت پرستانہ فسطائی رجحانات کو جنم دے سکتی ہے جن کی سیاست انتہائی ہٹ دھرم، بدبودار اور رجعتی ہوتی ہے۔ فسطائیت کی یہ وحشت رنگ، نسل، مذہب، فرقہ واریت غرضیکہ کسی بھی زہریلے تعصب پر ابھر سکتی ہے۔ ماضی میں ہٹلر اور مسولینی وغیرہ کے فاشزم کی بنیاد یہی پیٹی بورژوازی تھی۔ لیکن آج طبقاتی طاقتوں کا توازن بہت مختلف ہے۔ پیٹی بورژوازی بہت سکڑ چکی ہے اور پرولتاریہ دیوہیکل حجم اختیار کر چکا ہے۔

کمیونزم (Communism)

''نجی ملکیت انسان کی خود سے بیگانگی ہے اور کمیونزم اس کی مثبت تنسیخ ہے... یہ بطور سماجی یعنی انسانی وجود انسان کی اپنی آپ کی طرف مکمل واپسی ہے۔ ایک ایسی واپسی جو باشعور ہو چکی ہے اور ماضی کے ارتقا کی تمام تر دولت کو سمیٹے ہوئے ہے... یہ انسان اور فطرت اور انسان اور انسان کے درمیان تضاد کا حقیقی حل ہے... کمیونزم تاریخ کے معمے کا حل ہے اور اسے خود بھی معلوم ہے کہ یہی وہ حل ہے۔'' (کارل مارکس، معاشی وفلسفیانہ مسودات، 1844ء)

''کمیونزم پرولتاریہ کی آزادی کی شرائط کا نظریہ ہے۔'' (فریڈرک اینگلز، کمیونزم کے اصول، 1847ء)

اِس انقلابی نظریئے کے تحت قائم ہونے والے سماجی نظام اور سماج کے لئے بھی 'کمیونزم' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ ایک کمیونسٹ سماج میں ذرائع پیداوار پورے سماج کی اشتراکی ملکیت میں ہوتے ہیں۔ ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کے خاتمے سے پیداواری قوتیں اتنی ترقی کر جاتی ہیں کہ ضروریات زندگی کی بہتات پیدا ہو جاتی ہے اور یوں قلت اور استحصال کے خاتمے سے طبقات کا وجود بھی مٹ جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ریاست بھی رفتہ رفتہ مٹ جاتی ہے۔ ایسا سماج اِس قابل ہوتا ہے کہ مارکس کے الفاظ میں ''ہر کسی سے اُس کی اہلیت کے مطابق لیا جاتا ہے اور ہر کسی کو اُس کی ضرورت کے مطابق دیا جاتا ہے۔'' (گوتھا پروگرام کا تنقیدی جائزہ، 1875ء) ذہنی اور جسمانی محنت میں پائی جانے والی تفریق کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ نجی ملکیت اور طبقاتی استحصال کے خاتمے سے صنفی اور قومی استحصال کی بنیادیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ ہر فرد کو روٹی روزی کی فکر سے آزاد ہو کر اپنی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے مواقع میسر آتے ہیں۔ قلت کے خاتمے سے معاشی اونچ نیچ، غربت اور افلاس کا نام ونشان مٹ جاتا ہے اور یوں جرائم، حسد، مقابلہ بازی اور نفسانفسی جیسی وہ تمام سماجی لعنتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں جو اِن مسائل سے جنم لیتی ہیں۔ یوں اتنے بلند معیار کی ثقافت اور سماجی اقدار وجود میں آتی ہیں جن کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے ہی سماج میں انسان حقیقی معنوں میں آزاد ہو سکتا ہے اور حقیقی معنوں میں کائنات کی لامحدود وسعتوں کو تسخیر کرنے کے سفر کا آغاز کر سکتا ہے۔

سوشلزم (Socialism)

سرمایہ داری سے کمیونزم تک کا عبوری مرحلہ سوشلزم کہلاتا ہے۔ اِسے 'کمیونزم کا زیریں

(نچلا) مرحلہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے جس میں بورژوازی سے سیاسی اقتدار چھین لینے کے بعد پرولتاریہ اپنی انقلابی آمریت قائم کرے گا۔

''(مزدور پارٹی کے پروگرام کا تجزیہ کرتے وقت) ہمیں یہاں جس چیز سے بحث ہے وہ کمیونسٹ سماج ہے، ایسے نہیں جیسے کہ وہ خود اپنی بنیادوں پر کھڑا ہو گا، بلکہ اس کے برخلاف جو سرمایہ دارانہ سماج کی کوکھ سے تازہ تازہ ابھرا ہے اور معاشی، اخلاقی اور ذہنی ہر لحاظ سے اس پر اسی پرانے سماج کا جنم داغ باقی ہے جس کے بطن سے وہ پیدا ہوا ہے۔'' (کارل مارکس، گوتھا پروگرام کا تنقیدی جائزہ)

''سرمایہ دارانہ اور کمیونسٹ سماج کے درمیان ایک (سماج) کی دوسرے میں انقلابی تبدیلی کا مرحلہ موجود ہوتا ہے۔ اسی کی مطابقت سے ایک عبوری سیاسی مرحلہ بھی موجود ہوتا ہے جس میں ریاست 'پرولتاریہ کی آمریت' کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی۔'' (ایضاً)

''کمیونزم کے پہلے مرحلے میں دولت کا غیر منصفانہ فرق موجود رہے گا لیکن انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال ناممکن بن جائے گا کیونکہ ذرائع پیداوار پر قبضہ کر کے انہیں نجی ملکیت بنانا ناممکن ہو گا... کمیونسٹ سماج شروع میں اس حد تک رہنے پر مجبور ہے کہ ذرائع پیداوار کے نجی ملکیت بن جانے کی جو 'ناانصافی' ہے صرف اسی کو ختم کرے، یہ اس کے بس سے باہر ہے کہ فوراً ہی دوسری ناانصافی کو بھی مٹا دے جو استعمال کی چیزوں کی تقسیم میں پائی جاتی ہے جو 'انجام دی ہوئی خدمت یا محنت کے مطابق' ملتی ہیں (ہر ایک کی ضرورت کے مطابق نہیں)۔'' (لینن، ریاست اور انقلاب، 1917ء)

''اس مرحلے میں ہوتا یہ ہے کہ ذرائع پیداوار افراد کی نجی ملکیت نہیں رہتے بلکہ پورے سماج کی ملکیت ہو جاتے ہیں۔ سماج کا ہر ایک فرد جو سماجی ضرورت کے کاموں میں سے اپنے حصے کی کوئی خدمت انجام دیتا ہے، سماج ہی سے اس کی سند پاتا ہے کہ اس نے اتنا کام کیا ہے۔ یہ سند دکھا کر وہ سامان ضرورت کے پبلک سٹور سے کام کی مناسبت سے مقررہ سامان حاصل کر لیتا ہے۔ اس کی محنت کا جتنا صلہ ہونا چاہئے اس کا ایک حصہ پبلک فنڈ کے لئے نکال لیا جاتا ہے۔ لہٰذا ہر ایک کام کرنے والے کو اس کام کے مطابق جو اس نے سماج کے لئے انجام دیا ہے، معاوضہ مل جاتا ہے۔'' (ایضاً)

''لیکن سوشلزم اور کمیونزم کا سائنسی فرق بہت واضح ہے۔ جسے عام طور سے سوشلزم کہا جاتا

ہے، یہ وہی ہے جس کو مارکس نے کمیونسٹ سماج کے ''پہلے'' یا زیریں مرحلے سے تعبیر کیا تھا۔ جہاں تک کہ ذرائع پیداوار کے اشتراکی ملکیت بن جانے کا تعلق ہے تو (سوشلزم کے لئے) لفظ 'کمیونزم' بھی استعمال کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ ہم یہ نہ بھول جائیں کہ یہ مکمل کمیونزم نہیں ہے۔'' (ایضاً)

سوشلزم اگرچہ کمیونزم کا سب سے نچلا مرحلہ ہے لیکن تاریخی طور پر یہ سرمایہ داری سے آگے کا مرحلہ ہے۔ لہٰذا ایسا سماج ہی بجا طور پر سوشلسٹ قرار دیا جاسکتا ہے جس کی پیداواری قوتیں ترقی یافتہ ترین سرمایہ داری سے بھی زیادہ ترقی یافتہ ہوں۔ عام طور پر محنت کش طبقے کے اقتدار پر قبضے (سوشلسٹ انقلاب) کو ہی 'سوشلزم' قرار دے دیا جاتا ہے جو کہ درست نہیں ہے۔ بالخصوص برصغیر جیسے پسماندہ خطوں میں انقلاب کے ذریعے سرمایہ داری کا خاتمہ کرنے کے بعد پیداواری قوتوں کو ترقی دے کر بتدریج سوشلزم کی تعمیر کرنا ہوگی۔ لیکن ایک ملک کی حدود میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ اِس موضوع پر ہم آگے مزید روشنی ڈالیں گے۔

سوشلسٹ انقلاب کے فوری فرائض

سوشلسٹ انقلاب کے بعد سرمایہ دارانہ ریاست کو پاش پاش کر کے ایک مزدور ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے گا جو کسی اقلیتی استحصالی طبقے کی بجائے اکثریت کے جمہوری کنٹرول میں ہو گی اور محنت کش طبقے کے تاریخی فرائض سے مطابقت رکھتی ہوگی۔ تمام سامراجی قرضوں کو ضبط کر کے ادائیگیاں منسوخ کر دی جائیں گی۔ بینکوں، بھاری صنعت، سامراجی اثاثوں، ذرائع ابلاغ، توانائی اور ٹرانسپورٹ کے شعبوں کو فوری طور پر قومی ملکیت میں لے کر محنت کشوں کے جمہوری کنٹرول میں دیا جائے گا۔ یوں معیشت کے کلیدی حصوں کو اشتراکی ملکیت اور کنٹرول میں لینے کے بعد ایک منصوبہ بند معیشت تعمیر کی جائے گی جس میں پیداوار کا مقصد منافع خوری کی بجائے انسانی ضروریات کی تکمیل ہوگا۔ غیر ملکی تجارت پر ریاست کی اجارہ داری قائم کی جائے گی۔ اگر کچھ مخصوص صورتوں میں غیر ملکی سرمایہ کاری کی اجازت دی بھی جاتی ہے تو ایسا سخت ریاستی کنٹرول میں ہوگا اور ٹیکنالوجی کی جلد از جلد منتقلی کو یقینی بنایا جائے گا۔ جاگیرداری کی باقیات رکھنے والے پاکستان جیسے ممالک میں تمام بڑی جاگیروں کو قومی ملکیت میں لے کر مزارعوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ ریاستی فارموں میں سہولیات اور بہتر حالات کے ذریعے چھوٹے کاشتکاروں کو راغب کر کے

اجتماعی کاشتکاری کو فروغ دیتے ہوئے جدید تکنیکی بنیادوں پر زرعی انقلاب برپا کیا جائے گا۔محنت کش خواتین کو تمام شعبوں میں مساوی حقوق اور نمائندگی دی جائے گی۔خواتین کو گھریلو مشقت سے آزاد کرنے کے لئے پبلک کچن، لانڈریاں اور کنڈرگارٹن قائم کئے جائیں گے۔صحت اور تعلیم کو مفت اور بنیادی انسانی حق قرار دیا جائے گا۔ان بنیادی ضروریات زندگی کے کاروبار پر پابندی عائد کی جائے گی اور ہر فرد کو ان کی مفت اور باعزت فراہمی یقینی بنانے کے لئے بجٹ کا معقول حصہ مختص کیا جائے گا۔طبقاتی نظام تعلیم کا خاتمہ کیا جائے گا،طلبہ کو یونین سازی کا حق دیا جائے گا، نصاب اور طریقہ تعلیم کو جدید عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے گا،تعلیمی اداروں میں بیہودہ مقابلہ بازی کی بجائے اشتراک کو پروان چڑھایا جائے گا، ووکیشنل ٹریننگ کو فروغ دیا جائے گا، ناخواندگی کے خاتمے کے لئے ہنگامی منصوبہ سازی کی جائے گی۔رہائش کا مسئلہ حل کرنے کے لئے بڑے پیمانے پر تعمیرات کی جائیں گی۔تاہم فوری طور پر اس مسئلے سے نبٹنے کے لئے امرا کے بڑے بڑے محلات اور بند پڑے مکانوں اور فلیٹوں کو زیر استعمال لایا جائے گا۔ بوسیدہ اور بدحال انفراسٹرکچر کی جدید بنیادوں پر تعمیر نو کے لئے بڑے پیمانے کی ریاستی سرمایہ کاری کی جائے گی۔ کام کرنے کے قابل ہر شخص کو روزگار کی فراہمی مزدور ریاست کی ذمہ داری ہوگی اور بیروزگاری ایک ریاستی کوتاہی تصور ہوگی۔ جب معیشت نجی ملکیت اور منافع کی دم گھونٹ دینے والی جکڑ سے نکلے گی تو اتنا روزگار پیدا ہو سکے گا کہ مزدور ریاست یہ ذمہ داری ادا کر پائے گی۔ یوں بیروزگاری کے ساتھ اِس سے جنم لینے والی غلاظتوں کا بھی خاتمہ ہوگا۔تمام مظلوم قوموں کے حق خودارادیت بشمول حق علیحدگی کو تسلیم کیا جائے گا۔ یوں رضا کارانہ بنیادوں پر ایک سوشلسٹ فیڈریشن کا قیام ممکن ہو سکے گا۔مزدور ریاست کی خارجہ پالیسی طبقاتی بنیادوں پر استوار ہوگی اور دنیا بھر کی انقلابی تحریکوں کی حمایت کی جائے گی۔ ماضی میں کئے گئے تمام خفیہ سامراجی معاہدوں کو منظر عام پر لایا جائے گا اور فوراً منسوخ قرار دیا جائے گا۔مزدور ریاست کے امور میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والے انسانوں کو نجی زندگی میں مرضی کے عقائد رکھنے کی آزادی اور مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔فوج کے ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں گی اور اسے بتدریج عوامی ملیشیا میں ڈھالا جائے گا۔کمیشن سسٹم کا خاتمہ کیا جائے گا، افسروں اور سپاہیوں کی

تنخواہیں اور مراعات مساوی ہوں گی اور تمام افسران سپاہیوں کی کمیٹیوں کے ذریعے منتخب ہوں گے۔ ماضی میں محنت کش عوام کے خلاف جرائم میں ملوث تمام افراد کو خصوصی انقلابی عدالتوں کے کٹہروں میں کھڑا کر کے قرار واقعی سزائیں دی جائیں گی۔

مزدور ریاست کی عمومی ساخت اور طریقہ کار

سوشلسٹ انقلاب کے نتیجے میں قائم ہونے والی مزدور ریاست انسانی تاریخ کی سب سے جمہوری ریاست ہو گی جس میں پہلی بار امورِ معیشت اور ریاست کسی مٹھی بھر استحصالی طبقے کی بجائے اکثریت، یعنی محنت کشوں کے جمہوری کنٹرول میں ہوں گے۔ یوں اخلاقیات، اقدار، فنونِ لطیفہ، ثقافت اور صحافت پر بھی استحصالی طبقات کی جکڑ اور اجارہ داری کا خاتمہ ہوگا۔ نیچے سے اوپر تک ریاست کا ڈھانچہ جمہوری طور پر منتخب کردہ کمیٹیوں یا سوویتوں پر مشتمل ہوگا اور منتخب کرنے والوں کو اپنے نمائندے کسی بھی وقت واپس بلانے کا اختیار حاصل ہو گا۔ یہ ریاست استحصالی طبقات کی بچی کھچی مزاحمت کو کچلے گی اور سوشلسٹ بنیادوں پر ایک اعلیٰ سماج کی تعمیر کا فریضہ سرانجام دے گی۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو مزدور ریاست صرف انقلاب دشمن عناصر کے لئے ہی 'منظّم جبر کا ادارہ' ہوگی۔ جوں جوں سوشلزم کی تعمیر کا عمل آگے بڑھے گا، پیداواری قوتوں کی ترقی کیساتھ مانگ اور قلت کا خاتمہ ہوتا جائے گا اور بلند تر ثقافت پروان چڑھے گی، جبر کی ضرورت بھی ختم ہوتی چلی جائے گی اور یوں مزدور ریاست رفتہ رفتہ خود کو تحلیل کرتی جائے گی۔ لینن نے 1871ء کے پیرس کمیون کے اسباق کی روشنی میں انقلاب کے بعد تشکیل پانے والی مزدور ریاست کے کچھ بنیادی اصول وضع کئے تھے:

۱۔ ہر سطح پر آزادانہ انتخابات کے ذریعے اہلکاروں کا انتخاب۔ کسی بھی وقت اہلکاروں کو واپس بلانے کا اختیار (Right to Recall)

۲۔ کسی بھی اہلکار کی اجرت ایک ہنر مند مزدور سے زیادہ نہ ہونا

۳۔ باقاعدہ فوج کی بجائے عوامی ملیشیا کا قیام

۴۔ آبادی کی اکثریت صرف ووٹنگ سے بڑھ کر ریاستی امور کو چلانے میں بھی شامل ہو۔ ''سوشلزم میں سب باری باری حکومت میں حصہ لیں گے اور جلد ہی اس کے عادی ہو جائیں گے

کہ کوئی حکومت نہیں کرتا۔''

کیا ایک ملک میں سوشلزم کی تعمیر ممکن ہے؟

ملکوں یا قومی ریاستوں کی حدود کو خود سرمایہ داری نے روند ڈالا ہے اور ایک عالمی معیشت قائم کی ہے جس پر تمام قومی معیشتیں منحصر ہیں۔ یہ عالمی معیشت مختلف قومی معیشتوں کا جمع حاصل نہیں ہے بلکہ ایک دیوہیکل اور خود کار حقیقت ہے جس نے بین الاقوامی سطح پر محنت کی تقسیم کی ہے۔ مثلاً اگر ہم آج کے مشہور زمانہ 'آئی فون' کو ہی لیں تو اس کی سکرین، سٹوریج اور کیمرا جاپان کی کمپنیاں بناتی ہیں۔ بیٹری، وائی فائی اور ریڈیو ریسیور وغیرہ چین کے کمپنیاں بناتی ہیں۔ سافٹ وئیر امریکہ میں بنتا ہے۔ ریم اور پروسیسر کوریا کی کمپنیاں بناتی ہیں۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ ان کمپنیوں کے نیچے کئی ذیلی کمپنیاں ہیں اور پیداوار کی 'آوٹ سورسنگ' کا یہ سلسلہ درجنوں ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔ گویا ایک موبائل فون بنانے کے لئے بین الاقوامی سطح کی تقسیمِ محنت درکار ہے۔ ایک ''سوشلسٹ ملک'' کو یہ سب کچھ خود سے بنانے کے لئے دیوہیکل وسائل درکار ہوں گے، درجنوں نہیں سینکڑوں نئی صنعتیں لگانی پڑیں گی اور پھر سب سے اہم ٹیکنالوجی کا سوال ہے۔ یہ تمام تر ٹیکنالوجی شروع سے ایجاد کرنے کی کوشش یقیناً کوئی معقول خیال نہیں ہوگا۔ لیکن اگر ہم پھر بھی فرض کر لیں ایک الگ تھلگ ملک میں آئی فون بنا لیا جاتا ہے تو اِس کی پیداواری لاگت اتنی زیادہ ہوگی کہ یہ ساری مشقت معاشی حوالے سے ہی گھاٹے کا سودا ہوگی۔ ایک دوسری صورت یہ ہے کہ ہر طرف سے سرمایہ داری میں گھرے 'سوشلسٹ ملک' کو محنت کی عالمی تقسیم سے فائدہ اٹھانے کے لئے عالمی منڈی کا حصہ بننا ہوگا۔ لیکن عالمی منڈی میں تجارت کے لئے اسے ناگزیر طور پر منڈی کے قوانین کے تابع ہونا پڑے گا۔

سرمایہ دارانہ سماج کی پیداواری قوتیں عرصہ قبل قومی حدود سے تجاوز کر چکی ہیں اور پے در پے ہونے والی دو عالمی جنگوں نے دہائیاں قبل اِس حقیقت کا اظہار کر دیا تھا۔ یوں آج کے عہد میں باقی دنیا سے کٹ کر 'ایک ملک میں سرمایہ داری' بھی کہیں وجود رکھتی ہے نہ ایسا ممکن ہے۔ چونکہ تکنیک اور پیداواریت (Productivity) کے لحاظ سے سوشلزم کو سرمایہ داری سے آگے کا مرحلہ ہونا چاہئے لہٰذا قومی حدود کے اندر الگ تھلگ سوشلسٹ سماج تعمیر کرنا نہ صرف ناممکن ہے بلکہ پیداواری

قوتوں کو سرمایہ داری سے بھی پیچھے دھکیلنے کے مترادف ہے اور ایک رجعتی یوٹوپیا ہے۔ بالخصوص ایک پسماندہ ملک میں تو ایسا سوچا بھی نہیں جا سکتا کیونکہ مارکس کے الفاظ میں ''پیداواری قوتوں کی ترقی (سوشلزم کی) بالکل عملی شرط ہے کیونکہ اس کے بغیر مانگ پھیلتی ہے اور مانگ کے ساتھ ضروریاتِ زندگی کی جدوجہد دوبارہ شروع ہو جاتی ہے، جس کا مطلب ہے کہ تمام تر پرانی بکواس ناگزیر طور پر پھر سے شروع ہو جاتی ہے۔'' یوں ایک عالمی نظام کے خلاف جدوجہد بھی عالمی سطح پر کی جا سکتی ہے اور اس کی جگہ بھی ایک عالمی نظام ہی لے سکتا ہے۔ ایک ملک میں انقلاب برپا کر کے عالمی سرمایہ داری کو اکھاڑا نہیں جا سکتا ہے۔ ہاں مگر اِس عمل کا آغاز ضرور کیا جا سکتا ہے اور یہ ایک تاریخی فریضہ ہے جس میں کوتاہی ایک تاریخی جرم بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت میں بالشویک پارٹی نے ترقی یافتہ یورپ میں انقلابات کا انتظار کرنے کی بجائے پسماندہ روس میں سرکشی کی جرات مندانہ قیادت کرتے ہوئے سوشلسٹ انقلاب برپا کیا تھا اور انقلابِ روس کو دنیا بھر کے انقلابات کے لئے ایک تحریک اور عمل انگیز بنانے کی کوشش کی تھی۔ ٹراٹسکی نے 'انقلابِ روس کی تاریخ' میں واضح کیا تھا، ''سماج اتنے منطقی نہیں ہوتے کہ پرولتاریہ کی آمریتوں کی تاریخیں عین اُسی لمحے آ جائیں جب معاشی اور ثقافتی حالات سوشلزم کے لئے پک کر تیار ہو جائیں۔ انسانیت اگر اتنی نظم و ترتیب کے ساتھ ارتقا پذیر ہوئی ہوتی تو آمریت کی ضرورت ہی پیش نہ آتی، نہ ہی بالعموم انقلاب کی ضرورت پیدا ہوتی۔ زندہ تاریخی سماج بالکل بے آہنگ ہوتے ہیں اور جتنے بے آہنگ ہوتے ہیں اتنی ہی تاخیر زدہ اُن کی ترقی ہوتی ہے۔ یہ حقیقت اسی بے آہنگی کا ہم آہنگ اظہار تھی کہ روس جیسے پسماندہ سماج میں بورژوا حکومت کی مکمل فتح سے پہلے ہی بورژوازی گل سڑ چکی تھی اور سوائے پرولتاریہ کے کوئی نہ تھا جو قومی قیادت میں اس کی جگہ لے سکے۔''

مارکسزم (Marxism)

مارکسزم سے مراد وہ انقلابی نظریات ہیں جو کارل مارکس اور اُن کے عمر بھر کے ساتھی فریڈرک اینگلز نے انیسویں صدی میں پیش کئے۔ مارکسزم کے نظریات سائنسی سوشلزم کی بنیاد ہیں کیونکہ یہ سائنسی بنیادوں پر انسانی سماج کی تشریح کرتے ہیں۔ مارکس اور اینگلز سے پہلے سوشلسٹ تحریک یقیناً موجود تھی لیکن اِس پر یوٹوپیائی نظریات حاوی تھے۔ اِس خیال پرستانہ سوچ

کے مطابق سوشلزم کسی ازلی وابدی سچائی، برابری، بہتر اخلاقیات اور انصاف کا سوال تھا۔ یوٹوپیائی سوشلزم سرمایہ دارانہ طرز پیداوار اور اس کے مضمرات پر تنقید تو کرتا تھا لیکن ٹھوس وضاحت کرنے سے قاصر تھا کہ اِس نظام کے تحت استحصال کس چیز پر مبنی ہے، انسانی سماج کن مراحل سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے اور طبقات کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے۔ جیسا کہ فریڈرک اینگلز وضاحت کرتا ہے کہ ''سوشلزم کو ایک سائنس میں تبدیل کرنے کے لئے اِسے حقیقی بنیادوں پر استوار کرنا لازم تھا... ضروری تھا کہ سرمایہ دارانہ طرز پیداوار کو تاریخی تناظر میں واضح کیا جائے، ایک مخصوص تاریخی عہد میں اِس کی ناگزیریت کو واضح کیا جائے اور یوں اس کے ناگزیر زوال کو واضح کیا جائے۔ سرمایہ داری کے بنیادی کردار کو بے نقاب کرنا ضروری تھا جو اُس وقت تک پوشیدہ تھا۔'' ('سوشلزم، یوٹوپیائی اور سائنسی'، 1880ء) یہی تاریخی کارنامہ کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز نے انجام دیا۔ انہوں نے کلاسیکی جرمن فلسفے، کلاسیکی انگریزی سیاسی معاشیات اور فرانسیسی سوشلزم کے انقلابی نظریات کو نقطہ عروج تک پہنچا کر مربوط کیا۔ 1842ء میں پہلی ملاقات کے بعد مارکس اور اینگلز کے درمیان خط و کتابت کے ذریعے اِن موضوعات پر تبادلہ خیال مسلسل جاری رہا۔ انہوں نے سر کے بل کھڑے ہیگل کے فلسفے کو پیروں پر کھڑا کر کے اُس کے منطقی انجام تک پہنچایا۔ فرانس اور بیلجیم میں مشہور یوٹوپیائی سوشلسٹ اور انارکسٹ رہنما پرودھون کے ساتھ مباحث اور تحریری مناظروں میں حصہ لیا۔ پرودھون کی کتاب 'غربت کا فلسفہ' کے جواب میں مارکس نے 1847ء میں 'فلسفے کی غربت' نامی کتاب لکھی جس میں پرودھون کے خیال پرستانہ معاشی اور فلسفیانہ نظریات کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ 1848ء میں مارکس اور اینگلز نے مشہورِ زمانہ 'کمیونسٹ مینی فیسٹو' تحریر کیا جس کا شمار انسانی تاریخ کی سب سے موثر سیاسی دستاویزات میں ہوتا ہے۔ 1849ء میں برطانیہ منتقل ہو جانے کے بعد مارکس سیاسی معاشیات کے مطالعے میں مگن ہو گیا اور اپنی شہرہ آفاق تصنیف 'سرمایہ' پر انتھک کام کا آغاز کیا جس کی پہلی جلد 1867ء میں شائع ہوئی۔

یوں مارکس اور اینگلز نے نہ صرف تاریخ کے ارتقا کی وضاحت کی بلکہ سرمایہ دارانہ طرز پیداوار میں موجود تضادات کو آشکار کیا اور واضح کیا کہ پرولتاریہ ہی وہ انقلابی طبقہ ہے جسے خود سرمایہ داری نے جنم دیا ہے اور جسے سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے سرمایہ داری کے خاتمے کا تاریخی

فریضہ ادا کرنا ہے۔ بعدازاں ولادیمیر لینن اور لیون ٹراٹسکی نے نہ صرف مارکسزم کے نظریات کی ترویج کی بلکہ 1917ء کے انقلابِ روس کی شکل میں انہیں عملی جامہ پہنایا اور (70 دنوں پر مشتمل 1871ء کے پیرس کمیون کے بعد) دنیا کی پہلی مزدور ریاست کی بنیاد رکھی۔ 'لینن ازم' اور 'ٹراٹسکی ازم' درحقیقت مارکسزم کا ہی تسلسل ہے۔

'غیر ہموار اور مشترک ارتقا' اور 'انقلابِ مسلسل'

یہ دونوں تصورات ایک دوسرے سے وابستہ ہیں لیکن پہلے 'غیر ہموار اور مشترک ارتقا' کو سمجھنا ضروری ہے جس کا تصور ہمیں سب سے پہلے 1906ء میں شائع ہونے والی لیون ٹراٹسکی کی تصنیف ''انقلابِ مسلسل اور نتائج وتناظر'' میں ملتا ہے جس میں انہوں نے روس کے مخصوص طرزِ ارتقا کے پس منظر میں 1905ء کے انقلاب سے اہم نتائج اخذ کئے تھے۔ اپنی سب سے واضح اور مکمل شکل میں اِس اصطلاح کا استعمال اور وضاحت ہمیں لیون ٹراٹسکی کی شہرہ آفاق تصنیف 'انقلابِ روس کی تاریخ' میں ملتی ہے جو انہوں نے ترکی میں اپنی جلاوطنی کے دوران لکھی اور 1930ء میں روسی زبان میں شائع ہوئی۔

'غیر ہموار اور مشترک ارتقا' کے تصور کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ تکنیکی طور پر پسماندہ ممالک ایک سیدھی لکیر میں ترقی یافتہ ممالک کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے تاریخ کو بالکل اسی طرح نہیں دہراتے بلکہ ترقی یافتہ سماجوں کی انتہائی جدید حاصلات پسماندہ ممالک میں ضم ہو جاتی ہیں اور یوں ارتقا کی ایک نئی شکل جنم لیتی ہے۔ یہ تصور درحقیقت مارکس کے اِس خیال سے بظاہر برعکس تھا کہ ''صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملک اپنے سے کم ترقی یافتہ ملک کو اُس کے مستقبل کی تصویر ہی دکھاتا ہے'' جسے اُس وقت کے بہت سے مارکسسٹوں نے ایک طے شدہ کلیہ اور عقیدہ بنا لیا تھا۔ حالانکہ مارکسزم بذاتِ خود تاریخ کے بنے بنائے خاکوں اور کلیوں کی نفی کرتا ہے۔ لیکن ان کتاب پرست نظریہ دانوں کا خیال تھا پسماندہ روس میں بھی ترقی یافتہ فرانس اور برطانیہ وغیرہ کی طرز پر پہلے ایک بورژوا جمہوری انقلاب برپا ہوگا جس میں بورژوازی ہراول کردار ادا کرے گی اور جاگیرداری کا یکسر خاتمہ کرتے ہوئے جدید سرمایہ داری کی بنیادیں قائم کرے گی۔ مزید برآں سرمایہ دارانہ بنیادوں پر طویل ترقی کے بعد ہی سوشلسٹ انقلاب کا سوال پیدا ہو سکتا ہے کیونکہ ابھی 'سوشلزم کی

مادی بنیادیں' موجود نہیں ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ آج تقریباً سو سال بعد بھی پاکستان اور ہندوستان جیسے ممالک میں بہت سے 'کمیونسٹ' اِس فرسودہ نظریئے کے پیروکار ہیں۔ ٹراٹسکی نے اِس روایتی خیال کو یکسر رد کرتے ہوئے واضح کیا کہ روس اپنے ترقی یافتہ ہمسایوں سے کٹ کر نہیں بلکہ اُن کے عسکری اور اقتصادی جبر کے تحت آگے بڑھا ہے اور روسی صنعت مغرب کی طرح دستکاری سے ترقی پا کر وجود میں نہیں آئی بلکہ ترقی یافتہ مغربی ممالک کی سرمایہ کاری سے جدید ترین بنیادوں پر قائم ہوئی ہے۔ یعنی انتہائی پسماندہ روس میں انتہائی ترقی یافتہ صنعت موجود ہے جو حیران کن طور پر بعض صورتوں میں مغربی ممالک سے بھی زیادہ جدت اور حجم کی حامل ہے۔ یوں انتہائی جدت اور پسماندگی گڈ مڈ ہو گئے ہیں۔ اِسی کیفیت کو ٹراٹسکی نے 'غیر ہموار اور مشترک ارتقا' کا نام دیا۔ 'انقلابِ روس کی تاریخ' کے پہلے باب میں ٹراٹسکی وضاحت کرتا ہے:

''روس نہ صرف جغرافیائی طور پر بلکہ سماجی اور تاریخی طور پر بھی یورپ اور ایشیا کے بیچ میں تھا۔ اس کی سرحدیں یورپی مغرب اور ایشیائی مشرق سے لگتی تھیں، جہاں کے مختلف ادوار اور مختلف خدوخال تک اس کی رسائی تھی۔ مشرق سے اسے تاتاریوں کا طوق ملا، جو روسی ریاست کے ڈھانچے کے اندر اہم عنصر کے طور پر داخل ہو گیا۔ مغرب اس سے بھی زیادہ خطرناک دشمن تھا، لیکن ساتھ ہی ایک استاد بھی تھا۔ روس مشرق کی اشکال پر نہیں ڈھل سکا، کیونکہ اسے مغرب کی طرف سے مسلسل معاشی اور عسکری دباؤ کے تحت خود کو ڈھالنا پڑتا تھا... ایک پسماندہ ملک ترقی یافتہ ممالک کی مادی اور شعوری کامیابیاں اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ ایک غلام کی طرح اُن کے پیچھے چلتا ہے یا اُن کے ماضی کے تمام مراحل کو دہراتا ہے... اگرچہ ایک پسماندہ ملک ترقی یافتہ ممالک کی پیروی پر مجبور ہوتا ہے، لیکن چیزوں کو اسی ترتیب سے نہیں لیتا... تاریخ کے قوانین کسی طور بھی بنے بنائے کتابی خاکے نہیں ہوتے ہیں۔ ناہمواری، جو تاریخی عمل کا سب سے عمومی قانون ہے، پسماندہ ممالک کی تقدیر میں سب سے پیچیدہ اور ٹھوس انداز میں اپنا اظہار کرتی ہے۔ بیرونی ضرورت کے کوڑے کے تحت ان کی پسماندہ تہذیب چھلانگیں لگانے پر مجبور ہوتی ہے۔ یوں ناہمواری کے آفاقی قانون سے ایک اور قانون برآمد ہوتا ہے، جسے ہم کسی بہتر نام کی عدم موجودگی میں مشترک ترقی کا قانون کہہ سکتے ہیں، جس سے ہماری مراد سفر کے

مختلف مراحل کا اکٹھا ہو جانا، الگ الگ قدموں کا مل جانا، قدیم اور جدید صورتوں کا یکجا ہو جانا ہے۔اس قانون کے بغیر روس یا دوسرے، تیسرے یا دسویں تہذیبی درجے کے کسی ملک کی تاریخ کو سمجھنا ناممکن ہے۔''

یہی تصور لیون ٹراٹسکی کے 'انقلابِ مسلسل' کے نظریئے کی بنیاد ہے جس کے مطابق پسماندہ معاشروں کے لئے نہ صرف ترقی یافتہ معاشروں کے ارتقا کے پیروی کرنا لازم نہیں ہے بلکہ ایسے معاشروں کے حکمران طبقات کے مخصوص رجعتی کردار کی بدولت ایسا ممکن بھی نہیں ہے۔ مثلاً تاریخی طور پر سرمایہ دارانہ صنعتی انقلاب کے جو فرائض بورژوا طبقے نے مکمل کرنے تھے ان میں جدید قوم اور قومی ریاست کی تشکیل، جدید صنعتی معاشرے کے قیام کے لئے درکار بنیادی انفراسٹرکچر کی تعمیر، جاگیرداری کی باقیات کا خاتمہ اور صنعتی بنیادوں پر زرعی انقلاب، پارلیمانی جمہوریت کی استواری اور مذہب کو ریاست سے الگ کئے جانا شامل تھے۔لیکن ہم دیکھ سکتے ہیں پاکستان اور دوسرے سابقہ نوآبادیاتی ممالک کے حکمران 'آزادی' کے بعد ان میں سے کسی فریضے کی تکمیل نہیں کر سکے بلکہ ان کا کردار اپنی تاریخی تاخیر زدگی کی وجہ سے سامراجی ممالک کے گماشتوں اور کمیشن ایجنٹوں سے زیادہ نہیں ہے۔دوسرے الفاظ میں یہاں کے سرمایہ دار طبقہ اپنے ہی نظام کے تاریخی فرائض ادا کرنے سے قاصر ہے۔ لہٰذا ایسے ممالک میں سرمایہ داری کے تاریخی فرائض بھی سوشلسٹ اقدامات کے ذریعے ہی ادا ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ یہاں انقلاب کا کردار مسلسل ہو جاتا ہے یعنی وہ بورژوا مرحلے سے آگے بڑھ کر سوشلسٹ ہو جاتا ہے اور اس کی قیادت بھی وہ جدید ترین طبقہ ہی کر سکتا ہے جسے اِن پسماندہ سماجوں میں جدید ترین صنعت اور ٹیکنالوجی پیدا کرتی ہے، یعنی پرولتاریہ۔ٹراٹسکی مذکورہ بالا تصنیف میں ہی وضاحت کرتا ہے:

''تاریخی پسماندگی کی فوقیت، جو ایک حقیقت ہے، نہ صرف اجازت دیتی ہے بلکہ مجبور کرتی ہے کہ درمیان کے مراحل کو پھلانگ کے جو کچھ بھی پہلے سے تیار ہے اُسے اپنا لیا جائے۔وحشی اپنے تیر اور کمان پھینک کر فوراً رائفلیں اٹھا لیتے ہیں اور ماضی میں اِن دونوں ہتھیاروں کے درمیان موجود فاصلے کو پھلانگ جاتے ہیں۔ یورپی نوآبادکاروں نے امریکہ میں تاریخ دوبارہ سے شروع نہیں کی تھی۔ یہ حقیقت کہ جرمنی اور امریکہ اب معاشی طور پر برطانیہ کو پچھاڑ چکے ہیں، اُن کے

سرمایہ دارانہ ارتقا کی پسماندگی کی وجہ سے ہی ممکن ہوئی... تاہم 'مشترک ارتقا' کا قانون اپنا سب سے ٹھوس اظہار روسی صنعت کی تاریخ اور کردار میں کرتا ہے۔ تاخیر زدہ روسی صنعت نے ترقی یافتہ ممالک کے ارتقا کو نہیں دہرایا، بلکہ اپنی پسماندگی میں جدید ترین حاصلات کو اپناتے ہوئے خود کو ارتقا میں شامل کیا۔ جس طرح روس کا معاشی ارتقا بحیثیت مجموعی 'دستکار گلڈ' اور مینوفیکچر کے عہد سے چھلانگ کر آگے بڑھ گیا، اِسی طرح صنعت کی مختلف شاخوں نے بھی اُن تکنیکی پیداواری مرحلوں کے اوپر سے سلسلہ وار خصوصی چھلانگیں لگائیں جو مغرب میں دہائیوں پر محیط تھے... انقلاب تک کسانوں کی جانب سے زمین کی کاشت جب 17ویں صدی کی سطح پر تھی، عین اُسی وقت روسی صنعت اپنی تکنیک اور سرمایہ دارانہ ڈھانچے میں نہ صرف ترقی یافتہ ممالک کی سطح پر کھڑی تھی بلکہ کئی لحاظ سے اُن سے بھی آگے تھی... ملک کے اِسی عمومی ارتقا کی مناسبت سے روسی محنت کش طبقے نے دستکار گلڈ کی بجائے زراعت سے اور شہر کی بجائے دیہات سے اپنی تشکیل کی۔ مزید برآں روس میں برطانیہ کی طرح پرولتاریہ لمبے عرصے میں رفتہ رفتہ ماضی کا بوجھ ساتھ لے کر نمودار نہیں ہوا، بلکہ ماحول، رشتوں اور بندھنوں میں تیز تبدیلیوں پر مشتمل چھلانگوں کے ذریعے اور ماضی کے ساتھ یکلخت تعلق توڑ کر نمودار ہوا۔ اسی حقیقت نے زارشاہی کے مجتمع شدہ جبر کے ساتھ مشترک ہو کر روسی مزدوروں کو انقلابی سوچ پر مبنی انتہائی جرات مندانہ نتائج اخذ کرنے کے قابل بنایا، بالکل اسی طرح جیسے پسماندہ صنعتوں نے انتہائی جدید سرمایہ دارانہ تنظیم کو اپنا لیا تھا۔''

یوں پسماندہ روس کے غیر ہموار اور مشترک طرزِ ارتقا کی بدولت ایک ایسا طبقہ موجود تھا جو سرمایہ داری سے آگے کے تاریخی فرائض کا حامل تھا۔ اِسی لئے روس کا انقلاب سرمایہ دارانہ مرحلے کو پھلانگ کر براہِ راست سوشلسٹ مرحلے میں داخل ہو گیا۔ جیسا کہ لیون ٹراٹسکی نے 1906ء میں پیش گوئی کی تھی:

''انقلابِ مسلسل کے تناظر کو مختصراً کچھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے: روس میں جمہوری انقلاب کی مکمل فتح صرف پرولتاریہ کی آمریت (سوشلزم) کی صورت میں ہی ممکن ہے۔ پرولتاریہ کی آمریت، جو ایجنڈے پر نہ صرف جمہوری بلکہ سوشلسٹ فرائض بھی رکھ دے گی، عین اسی وقت بین الاقوامی سوشلسٹ انقلاب کو بھی طاقتور تحریک دے گی۔ مغرب میں پرولتاریہ کی فتح ہی روس کو

سرمایہ داری کی بحالی سے بچاسکتی ہے اور سوشلزم کی تعمیر کی ضامن بن سکتی ہے۔‘‘

یوں انقلاب نہ صرف زمان (Time) میں مسلسل ہو جاتا ہے کیونکہ سرمایہ داری کے مرحلے کو پھلانگ جاتا ہے بلکہ سرحدوں کو پھلانگتے ہوئے مکان (Space) میں بھی مسلسل کردار اختیار کر لیتا ہے۔ ’’مرحلہ وار انقلاب‘‘ کی فرسودہ اور رجعتی تھیوری کے برعکس لیون ٹراٹسکی کے یہی نظریات ہیں جو نہ صرف ہمارے جیسے پسماندہ خطوں کی مخصوص طبقاتی اور سماجی ساخت کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں بلکہ یہاں سوشلسٹ انقلاب کے رجائیت بھرے امکان کو واضح کرتے ہیں۔

سوشلزم اور ’انسانی فطرت‘

سرمایہ داری کے حامیوں کی جانب سے سوشلزم پر سب سے بڑا اعتراض یہی اٹھایا جاتا ہے کہ یہ نام نہاد ’انسانی فطرت‘ سے مطابقت نہیں رکھتا اور انسان فطرتاً لالچی ہے، مقابلہ بازی فطری ہے، پیسہ انسان کی قوت محرکہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ درحقیقت یہ سارے ’دلائل‘ مغالطّوں پر مبنی ہیں اور ذرا سا غور کرنے پر بالکل مضحکہ خیز معلوم ہونے لگتے ہیں۔ سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ نام نہاد انسانی فطرت کیا چیز ہے اور کہاں سے برآمد ہوتی ہے؟ ’انسانی فطرت‘ کوئی مستقل یا غیر متغیر چیز نہیں ہے بلکہ انسانوں کے مادی حالات اُن کی سوچ، عادات واطوار، رویوں اور ترجیحات کا تعین کرتے ہیں۔ کائنات کی ہر چیز کی طرح انسان کا شعور بھی مسلسل تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ لاکھوں سالوں تک انسان استحصال سے پاک غیر طبقاتی معاشرے میں زندگی گزارتا رہا ہے جس کی باقیات آج بھی ہمیں ملتی ہیں۔ یہ مخصوص حالات کا جبر تھا جس نے طبقات کو جنم دیا۔ چونکہ حکمران طبقات کی عیاشیاں اور مراعات ایک طبقاتی سماج سے مشروط تھیں لہٰذا آج تک کا ہر حکمران طبقہ طبقاتی سماج کی تمام تر ذلتوں کو ’انسانی فطرت‘ قرار دیتا آیا ہے۔ لیکن اگر ہم طبقاتی سماجوں کی تاریخ ہی دیکھیں تو ’انسانی فطرت‘ مسلسل بدلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایک زمانے میں انسانوں کو غلام بنانا اور اُن سے جانوروں جیسا برتاؤ کرنا عین ’فطری‘ تھا۔ اِسی طرح مطلق العنانیت میں بادشاہوں کے حق حکمرانی کو نہ صرف ’فطری‘ بلکہ خدا کی طرف سے تفویض کردہ سمجھا جاتا ہے۔ بالفرض آپ اُن سماجوں کے کسی انسان کے سامنے جمہوریت، برابری، آزاد منڈی وغیرہ (جو سب سرمایہ داری کے نعرے ہیں) کی بات کرتے تو یقیناً اُسے یہ سب کچھ اُتنا ہی

'غیر فطری' لگتا جتنا کہ آج سرمایہ داری کے حامیوں کو سوشلزم لگتا ہے۔ سرمایہ داری کے حامی جب اپنے نظام کو 'فطری' قرار دیتے ہیں تو درحقیقت وہ استحصال، بھوک، غربت، جنگوں، دہشت گردی، انتہاؤں کو چھوتی معاشی ناہمواری، جرائم، خودکشیوں، نفسانفسی اور اِس نظام کی تمام تر دوسری لعنتوں کو 'فطری' قرار دے رہے ہوتے ہیں۔ کیا یہ تمام تر ذلتیں انسانیت کا مقدر ہیں؟ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ آج کرہ ارض پر انسانوں کی اکثریت اِس نظام کے پیدا کردہ حالات سے نہ صرف سخت بیزار ہے بلکہ اِن کے خلاف مختلف شکلوں میں بغاوتیں بھی کر رہی ہے۔

''پڑھے لکھے'' اور درمیانے طبقے کے افراد یہ دلیل بھی اکثر دیتے ہیں کہ زندگی میں پیسہ یا انفرادی فائدہ ہی ہر سرگرمی کی ترغیب (Incentive) ہوتا ہے۔ یہ دلیل بھی انسان کی 'لالچی فطرت' کے زمرے میں ہی آتی ہے اور سراسر بے بنیاد ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ حادثات یا قدرتی آفات جیسے غیر معمولی حالات میں بے شمار لوگ کسی مادی ترغیب، لالچ اور اپنی جان کی پرواہ کے بغیر دوسرے انسانوں کی مدد کو بھاگتے ہیں، خون کے عطیات دیتے ہیں، متاثرین کی ڈھارس بندھاتے ہیں۔ درحقیقت انسانی نفسیات میں ہونے والی جدید ترین تحقیقات ثابت کرتی ہیں کہ کسی دوسرے انسان کو مشکل میں دیکھ کر سب سے پہلے اُس کی مدد کا خیال آتا ہے اور اس کے بعد اپنی حفاظت وغیرہ کا خیال آتا ہے۔ اگر غور کریں تو انسان کو اعلیٰ ترین درجے کی خوشی اور اطمینان انہی کاموں میں ملتا ہے جو وہ بے لوث ہو کر دوسرے انسانوں کی بھلائی کے لئے کرتا ہے۔ چنانچہ ہر چیز کو پیسے کی ترغیب سے جوڑنا' سرمایہ داری کی مسلط کردہ غلیظ اقدار اور نفسیات کی پیداوار ہے۔ اِس سے روح اور احساس کی غربت کا اظہار ہوتا ہے۔ خود ہمارے خطے میں قدیم وادی سندھ کی تہذیب کی مثال ثابت کرتی ہے کہ استحصال اور پیسے کی ہوس کے بغیر بھی انسان تعمیر اور تخلیق کی بلندیوں کو چھو سکتا ہے۔

سرمایہ داری درحقیقت بہتات میں قلت کا نظام ہے۔ آج ایک طرف وہ تمام تر وسائل موجود ہیں جن سے تمام انسانوں کو ایک بلند تر معیار زندگی دیا جا سکتا ہے۔ لیکن دوسری طرف انسانوں کی اکثریت قلت میں سسک رہی ہے۔ آج دولت کا ارتکاز اِس حد تک بڑھ گیا ہے کہ صرف آٹھ امیر ترین افراد کے پاس دنیا کی آدھی آبادی (3.6 ارب) سے زیادہ دولت ہے۔

2017ء میں پیدا کردہ تمام تر دولت کا 82 فیصد صرف ایک فیصد امیر ترین لوگوں کے حصے میں آیا جبکہ غریب ترین 50 فیصد کی جمع پونجی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ ایک فیصد امیر ترین افراد کے اثاثوں میں 762 ارب ڈالر کا اضافہ ہوا۔ یہ اتنی دولت ہے جس سے دنیا میں غربت کا سات بار خاتمہ کیا جا سکتا تھا۔ انسانوں کی وسیع اکثریت کیلئے یہی قلت تمام تر انتشار، مقابلہ بازی اور خود غرضی کی وجہ بنتی ہے۔ سرمایہ داری میں تمام تر ضروریاتِ زندگی کی فراہمی پیسے سے مشروط ہے جس کے پیچھے انسان کو بھاگنے پر مجبور کر دیا گیا ہے اور پھر اِسے ہی انسانی فطرت قرار دے دیا جاتا ہے۔ سوشلزم انسانیت کی لاکھوں سالوں کی محنت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ٹیکنالوجی کے ثمرات کو تمام انسانوں تک پہنچائے گا اور بہتات پر مبنی سماج قائم کرے گا جس میں ایک بلند درجے کی تہذیب پروان چڑھ سکے گی اور لالچ، حسد، مقابلہ بازی جیسی غلاظتوں کی مادی بنیادیں ہی مٹ جائیں گی۔

یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ ایک سوشلسٹ یا کمیونسٹ سماج میں جب سب کو سب کچھ مل جائے گا تو انسان سست اور کاہل ہو جائے گا اور کوئی کام نہیں کرے گا۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اِس سماج میں ''کام'' صرف ایسی سرگرمی کو سمجھا جاتا ہے جو انسان پیسہ کمانے کے لئے مجبوراً کرتا ہے۔ آج انسانوں کی اکثریت کو اپنے جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے ''کام'' کرنا پڑتا ہے۔ یعنی دن کا بیشتر حصہ ایسی سرگرمی میں گزارنا پڑتا ہے جو اُن کے شوق یا دلچسپی سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا انسان اپنے کام سے بیگانہ ہے اور اِسی بیگانگی کو کاہلی یا کام چوری وغیرہ کا نام دیا جاتا ہے۔ ایک کمیونسٹ سماج میں ہر انسان کو اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے اور بروئے کار لانے کے مواقع میسر ہوں گے اور روٹی روزی کی فکر سے آزاد ہو کر انسان وہ کر پائے گا جو وہ کرنا چاہتا ہے۔ یوں انسان آج کی نسبت کہیں زیادہ سرگرم اور فعال ہو گا اور تخلیقی عمل کی ایسی بلندیوں کو پہنچے گا جن کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اِس نظامِ سرمایہ داری نے انسان کو مشین بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس کی حیثیت پیداوار کے عمل میں ایک پرزے سے زیادہ نہیں ہے۔ ایک ایسا پرزہ جس کی کوئی مرضی و منشا نہیں ہے۔ اُسے بس مرتے دم تک چلتے رہنا ہے۔ اِس نظام میں جوں جوں ٹیکنالوجی جدید ہوتی ہے محنت کشوں کے اوقات کار سہل ہونے کی بجائے مزید سخت ہوتے

جاتے ہیں۔ چونکہ سرمایہ داروں کے منافعوں کے لئے ضروری ہے کہ آبادی کا وسیع حصہ انتہائی تلخ حالات میں مسلسل مشقت کرتا رہے اور کوئی سوال نہ اٹھائے لہٰذا حکمران طبقات کی فکر و دانش میں ''کام'' کی عظمت کے گن گائے جاتے ہیں۔ محنت کشوں کو کام چور اور کاہل قرار دیا جاتا ہے اور سرمایہ داروں کی دولت کو اُن کی ''محنت'' کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے حالانکہ یہ محنت کشوں کی چوری شدہ محنت ہوتی ہے۔ ہم کمیونسٹ سمجھتے ہیں کہ سست اور کاہل ہونا ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ انسان کی زندگی کی مقصد جانوروں کی طرح تمام عمر مشقت کرنا نہیں بلکہ غور و فکر کرنا ہے، اپنے جمالیاتی ذوق کی تسکین ہے، تخلیق اور تسخیر کائنات ہے۔ اِس سب کے لئے ضروریات زندگی کی فکر سے آزادی اور فراغت درکار ہے۔ آج پیداواری قوتیں جتنی ترقی کر چکی ہیں اس کے پیش نظر ایسے سماج کی تعمیر ممکن ہے جہاں ہر انسان کو یہ معاشی آزادی اور فراغت فراہم کی جاسکتی ہے۔

سوشلزم اور قومی سوال

''فتحیاب سوشلزم کو مکمل جمہوریت قائم کرنا ہوگی اور نتیجتاً تمام قوموں کو نہ صرف مساوی حقوق دینا ہوں گے بلکہ محکوم قوموں کو حقِ خودارادیت یعنی سیاسی علیحدگی کا حق بھی دینا ہوگا۔ ایسی تمام سوشلسٹ پارٹیاں سوشلزم سے غداری کی مرتکب ہوں گی جو نہ صرف آج بلکہ انقلاب کے دوران اور اس کی فتح کے بعد اپنے عمل سے ثابت نہیں کرتیں کہ وہ محکوم قوموں کو آزادی دیں گی اور اُن کے ساتھ آزادانہ اتحاد کی بنیاد پر تعلق قائم کریں گی۔ اور علیحدگی کے حق کے بغیر 'آزادانہ اتحاد' ایک کھوکھلا لفظ ہے۔'' (ولادیمیر لینن، سوشلسٹ انقلاب اور قوموں کا حقِ خودارادیت، 1916ء)

''سوشلزم کا مقصد نہ صرف چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں انسانیت کی موجودہ تقسیم کو مٹانا ہے، نہ صرف قوموں کو ایک دوسرے کے قریب لانا ہے بلکہ انہیں ایک دوسرے میں ضم کر دینا ہے۔'' (ایضاً)

کمیونسٹ نہ صرف قومی جبر و استحصال کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ اِس کے خلاف دوٹوک اور واضح موقف بھی اپناتے ہیں۔ لیکن ہم قومی جبر و استحصال کے خلاف جدوجہد کو طبقاتی جدوجہد سے جوڑتے ہیں اور واضح کرتے ہیں کہ کوئی بھی قوم کوئی یکجا اکائی نہیں ہوتی بلکہ طبقات پر مشتمل ہوتی ہے اور ایک محکوم قوم کے حکمران طبقے کا کردار ہمیشہ حاکم قوم کی کاسہ لیسی اور گماشتگی پر مبنی ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں قومی محکومی سے ''آزادی'' کے معانی بھی حکمران طبقات اور محنت کش طبقات کے

لئے نہ صرف مختلف بلکہ متضاد ہوتے ہیں۔ حکمران طبقات کے لئے ’’آزادی‘‘ کا مطلب بلاشرکت غیر لوٹ مار اور استحصال کی آزادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جب کہ محنت کش طبقات کی جدوجہد معاشی اور سیاسی آزادیوں کے لئے ہوتی ہے جن کا حصول آخری تجزیئے میں طبقاتی آزادی کے بغیر ناممکن ہوتا ہے۔ یہاں حقِ علیحدگی کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ کمیونسٹ جہاں علیحدگی کے حق کو کسی منافقت کے بغیر تسلیم کرتے ہیں وہاں اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم علیحدگی کی وکالت کرتے ہیں۔ ولادیمیر لینن اِس نکتے کو طلاق کی مثال کے ذریعے بڑی خوبصورتی سے واضح کیا کرتے تھے کہ طلاق کے حق کو تسلیم کرنے کا مطلب طلاق کی حمایت اور وکالت ہرگز نہیں ہے۔

لیون ٹراٹسکی نے انقلابِ روس برپا کرنے والی بالشویک پارٹی کے قومی سوال کی طرف موقف اور طرزِ عمل کو بہت جامع انداز میں واضح کیا تھا جو آج بھی انقلابیوں کے لئے مشعلِ راہ ہے:

’’لینن بہت پہلے ہی روس میں مرکز گریز قومی تحریکوں کے پنپنے کی ناگزیریت کو بھانپ چکا تھا، اِسی لئے کئی سال تک ... پرانے پارٹی پروگرام کے پیراگراف 9 کے لئے سختی سے لڑتا رہا، جو قوموں کے حق خودارادیت یعنی ریاستوں کے طور پر اُن کی یکسر علیحدگی کے حق پر مبنی تھا۔ اِس طرح سے بالشویک پارٹی کسی طور پر بھی علیحدگی کی تبلیغ نہیں کر رہی تھی، بلکہ کسی قومیت کو بڑی ریاست کی حدود میں زبردستی مقید رکھنے سمیت قومی جبر کی ہر شکل کے خلاف بے رحم جدوجہد کا فریضہ اپنے لئے متعین کر رہی تھی۔ روسی پرولتاریہ صرف اِسی طرح سے محکوم قومیتوں کا اعتماد بتدریج حاصل کر سکتا تھا۔

’’لیکن یہ معاملے کا صرف ایک رُخ تھا۔ قومی میدان میں بالشویزم کی حکمت عملی کا ایک دوسرا رخ بھی تھا، جو بظاہر پہلے رخ سے متضاد تھا، لیکن درحقیقت اُسے مکمل کرتا تھا۔ پارٹی اور بالعموم تمام مزدور تنظیموں کے ڈھانچے میں بالشویزم ایک غیر لچکدار مرکزیت پر زور دیتا تھا اور قوم پرستی کے ہر اُس کلنک کے خلاف بے رحم جنگ کرتا تھا جو مزدوروں کو ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کرے یا اُنہیں غیر متحد کرے۔ ایک قومی اقلیت پر لازمی شہریت یا ریاستی زبان مسلط کرنے کے بورژوا ریاستوں کے اختیار کو یکسر مسترد کرتے ہوئے بالشویزم نے عین اسی وقت رضا کارانہ طبقاتی ڈسپلن کے ذریعے مختلف قومیتوں کے مزدوروں کو ہر ممکن حد تک مضبوطی سے یکجا کرنے کو حقیقی معنوں میں مقدس فریضے کا درجہ دیا۔ یوں بالشویزم نے پارٹی کی تعمیر میں قومی وفاق کے

اصول کو یکسر مسترد کر دیا۔ایک انقلابی پارٹی مستقبل کی مزدور ریاست کا نمونہ نہیں بلکہ محض اُس کی تخلیق کا اوزار ہوتی ہے۔ایک اوزار کو پیداوار کی تخلیق کے لئے موزوں ہونا چاہئے؛اوزار میں ہی پیداوار کا شامل ہونا ضروری نہیں۔ یوں فریضہ اگر مرکزیت پر مبنی قومی جبر کو توڑنے کا بھی ہو تو ایک مرکزیت پر مبنی تنظیم ہی انقلابی جدوجہد کی کامیابی کی ضامن بن سکتی ہے۔''(انقلابِ روس کی تاریخ)

زار شاہی روس کی نصف سے زیادہ آبادی محکوم قوموں (یوکرائنی، پول، فن، جارجیائی، وسط ایشیائی مسلمان اقوام وغیرہ) پر مشتمل تھی جو بدترین ریاستی جبر و استحصال کا شکار تھیں۔ روس کو 'محکوم قوموں کا جیل خانہ' بھی کہا جاتا ہے۔ 1917ء کا انقلاب جوں جوں محکوم قوموں میں سرایت کرتا گیا واضح ہوتا گیا کہ اِن قوموں کے حکمران طبقات بھی روسی حکمران طبقات کی ہی زبان بولتے تھے، اُن کے کاسہ لیس تھے اور اپنی لوٹ مار کے لئے اُن پر پوری طرح منحصر تھے۔لیکن جونہی روس میں پرولتاریہ کی آمریت کا قیام یقینی ہونے لگا اور بالشویک پارٹی اقتدار کے قریب ہونے لگی، یہی کاسہ لیس حکمران طبقات روس سے علیحدگی اور 'قومی آزادی' کے سب سے بڑے علمبردار بن گئے۔ دوسری طرف لینن ڈیڑھ دہائی تک روسی شاونزم کے تمام رنگوں کے خلاف بے رحم جدوجہد کرتے ہوئے تمام محکوم قوموں کے حق علیحدگی کے لئے لڑتا رہا تھا۔ بالشویکوں پر روس کو توڑنے کی خواہش کا الزام لگتا تھا، لیکن قومی مسئلے کی طرف اُن کا طبقاتی موقف ہی تھا جس نے زار شاہی روس کی محکوم قوموں کا اعتماد جیتا اور زار شاہی کے کھنڈرات پر آزاد اور خود مختیار اقوام پر مبنی ایک مزدور ریاست کی بنیاد رکھی۔

روس نے اپنی تاریخی تاخیرزدگی کی وجہ سے قومیتوں پر مشتمل ریاست کی شکل اختیار کی تھی۔آج ہم دیکھ سکتے ہیں پاکستان جیسے پسماندہ ممالک میں بھی گلی سڑی سرمایہ داری اپنے دوسرے تاریخی فرائض کی طرح قومی سوال حل کرنے اور ایک یکجا قوم کی تشکیل میں بھی ناکام رہی ہے۔ یہاں قومی بنیادوں پر جبر و استحصال ایک حقیقت ہے جس میں محکوم اقوام کے بالادست طبقات نہ صرف خود ملوث ہیں بلکہ قومی مسئلے کو اپنے سیاسی اور مالی مفادات کیلئے استعمال بھی کرتے ہیں۔ اِسی طرح قوم پرست قیادتوں کے کچھ دھڑے مختلف سامراجی قوتوں کی پراکسیوں کے طور پر بھی سرگرم ہیں۔ اِن سامراجی قوتوں کے مقاصد اور مفادات بھی اُن جابر حکمران طبقات سے کسی

طور مختلف نہیں ہیں جن کی یہ بظاہر دشمن ہیں۔ ایسے میں سرمایہ دارانہ نظام میں رہتے ہوئے محکوم قوموں کی 'آزادی' کا نعرہ سراسر فریب ہے اور ایک سوشلسٹ انقلاب ہی تمام تر قدرتی وسائل اور ذرائع پیداوار کو اشتراکی ملکیت میں لا کر قومی جبر و استحصال کی بنیادوں کو مٹا سکتا ہے۔

سوشلزم اور ماحولیات کا مسئلہ

پچھلی کچھ دہائیوں سے ماحولیاتی تبدیلیوں اور آلودگی کے خلاف عالمی سطح پر زور پکڑتی ہوئی مہم میں ماحولیات پر سیاست کرنے والی 'گرین' پارٹیاں اور این جی اوز پیش پیش ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام منافعوں کی ہوس میں نہ صرف انسانیت کو معاشی اور سماجی طور پر روندتا چلا جا رہا ہے بلکہ ماحول کو تباہ کر کے سیارے پر سے زندگی کا خاتمہ کر دینے کے درپے ہے۔ ماحول کا بگاڑ نہ صرف نسل انسان کے مستقبل کو غیر محفوظ بنا رہا ہے بلکہ روزمرہ زندگی کی تلخی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ ماضی میں شہری زندگی کی سماجی اور مادی آلائشوں سے پاک تصور کئے جانے والے سرسبز دیہات آج غلاظت اور کوڑے کے ڈھیروں سے اٹے ہوئے ہیں۔ بڑے پیمانے پر جنگلات کا صفایا، صنعتی آلودگی، کیڑے مار ادویات کے بے دریغ استعمال، زرخیز زمینوں پر منصوبہ بندی سے عاری تعمیرات اور نکاس کے نظام کی عدم موجودگی نے دیہاتی طرز زندگی کو ہی مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔

شہروں کی بات کی جائے تو ''سموگ'' (دھند کی شکل اختیار کرنے والا زہریلا دھواں) معمول بن چکی ہے۔ آلودگی سے پاک توانائی کے ذرائع میسر ہونے کے باوجود محض منافعوں کے لئے 89 ملین بیرل تیل روزانہ جلایا جا رہا ہے، کوئلہ اور گیس وغیرہ اس کے علاوہ ہیں۔ عالمی توانائی کا 87 فیصد فاسل فیول سے حاصل کیا جا رہا ہے اور 40 ارب ٹن کاربن ڈائی آکسائیڈ ہر سال فضا میں چھوڑی جا رہی ہے۔ گرین ہاؤس گیسوں کے اس اخراج سے درجہ حرارت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ درجہ حرارت کے لحاظ سے پچھلی صدی کی آخری دو دہائیاں گزشتہ چار سو سال کا گرم ترین عرصہ تھا۔ ''گلوبل چینج ریسرچ پروگرام' کے مطابق گزشتہ پچاس سال کے دوران امریکہ کے درجہ حرارت میں دو ڈگری سنٹی گریڈ کا اضافہ ہو چکا ہے۔ 'IPCC' کی سالانہ رپورٹ کے مطابق صنعتی انقلاب کے بعد سے فضا میں 500 ارب ٹن کاربن ڈائی آکسائیڈ کا اضافہ ہو چکا ہے، نتیجتاً گزشتہ ایک صدی کے دوران عالمی درجہ حرارت میں ایک ڈگری سنٹی گریڈ کا اضافہ ہوا ہے جس سے قطبین

کی برف پگھل رہی ہے اور 1870ء کے بعد سے سمندری سطح 8 انچ بلند ہو چکی ہے۔ ماہرین کی جانب سے اس صدی کے اختتام تک اس میں مزید 23 انچ اضافے کا خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے۔ یہ خدشہ بھی ظاہر کیا جا رہا ہے کہ 2040ء تک قطب شمالی کی برف مکمل طور پر پگھل جائے گی اور دنیا کے بیشتر ساحلی خطے زیر آب آ جائیں گے۔

ایک طرف کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار تیزی سے بڑھ رہی ہے تو دوسری طرف اس گیس کو ری سائیکل کرنے والے جنگلات کا خاتمہ کیا جا رہا ہے۔ دنیا میں کل آکسیجن کا 20 فیصد پیدا کرنے کی وجہ سے ''دنیا کے پھیپھڑے'' قرار دیئے جانے والے امازون کے جنگلات کو تیزی سے کاٹا جا رہا ہے اور صرف 1991ء سے 2000ء تک کے دس سالوں میں امازون کے 172000 مربع کلومیٹر پر سے درختوں کو صفایا کر دیا گیا ہے۔ عالمی سطح پر ہر سیکنڈ میں اوسطاً ڈیڑھ ایکڑ جنگل کا خاتمہ کیا جا رہا ہے جس سے ماحول کے ساتھ ساتھ حیاتیاتی نظام بھی بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ جنگلات کی تباہی سے نباتات، حشرات اور جانوروں کی 137 انواع ہر روز معدوم ہو رہی ہیں۔

''منصوبہ بند متروکیت'' (Planned Obsolescence) کا مظہر سرمایہ داری کی تاریخی متروکیت اور پاگل پن کی اہم علامت ہے۔ درسی نصاب ہوں یا ذرائع ابلاغ، اس نظام کے دانشور اور معیشت دان ''منڈی کے مقابلے'' کے تحت صارف کو ملنے والی ''اعلیٰ کوالٹی'' کی اشیا کا درس دیتے نہیں تھکتے، حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ''منصوبہ بند متروکیت'' کا ''بزنس ماڈل'' خاص طور پر 1929ء کے مالیاتی کریش کے بعد سے دنیا بھر میں اپنایا گیا ہے جس کے تحت مصنوعات کو ڈیزائن ہی اس طرح کیا جاتا ہے کہ وہ ایک مخصوص عرصے کے بعد خراب ہو کر ناقابل استعمال ہو جاتی ہیں اور صارف کو لامحالہ طور پر دوبارہ منڈی کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ کپڑے، موبائل، کمپیوٹر، بلب، عمارات غیرضیکہ روزمرہ استعمال کی کم و بیش ہر چیز کی پیداوار میں یہ طریقہ کار استعمال کیا جاتا ہے جس کا نتیجہ انسانی محنت، خام مال اور قدرتی وسائل کے بے نظیر ضیاں اور بلاضرورت ماحولیاتی آلودگی کی شکل میں برآمد ہوتا ہے۔ عالمی سرمایہ داری کا علمبردار جریدہ (اکانومسٹ) اعتراف کرتا ہے کہ ''نائیلون کی جرابیں 'منصوبہ بند متروکیت' کی کلاسیکی مثال تھیں۔ یہ جرابیں جلد ادھڑ جاتی تھیں اور صارف کو نیا جوڑا خریدنا پڑتا تھا جس کی وجہ سے جرابیں بنانے والی کمپنیوں نے لمبے عرصے تک

ایسے کسی ریشے کے استعمال پرغور ہی نہیں کیا جو جلدی ادھڑتا نہ ہو۔‘‘

اس نظام کے معذرت خواہان میں تمام تر مسائل کا الزام ’’زیادہ آبادی‘‘ پر ڈال دینے کا رجحان بھی پایا جاتا ہے۔ یہ مفروضہ سراسر بے بنیاد ہے۔ آج وہ ٹیکنالوجی اور وسائل موجود ہیں کہ دنیا کی موجودہ آبادی سے کہیں زیادہ انسانوں کو تمام تر ضروریات زندگی فراہم کی جاسکتی ہیں۔ امریکہ کی ’’انوائرمینٹل پروٹیکشن ایجنسی‘‘ کے مطابق ’’اناج کی موجودہ پیداوار 1931ء میں حاصل کرنے کے لئے امریکی کسانوں کو 490 ملین ایکڑ اضافی درکار ہوتے۔‘‘ گزشتہ دوسو سالوں کے دوران عالمی جی ڈی پی میں اضافے کی شرح آبادی سے کہیں زیادہ رہی ہے لیکن اس دولت کی تقسیم انتہائی غیر ہموار ہے۔ ضروریات زندگی کی قیمتیں آج کئی گنا کم کی جاسکتی ہیں لیکن اس سے سرمایہ داروں کی شرح منافع پر ضرب لگتی ہے۔ ’’فوڈ فرسٹ‘‘ نامی تنظیم کے مطابق عالمی سطح پر دس ارب انسانوں کی خوراک پہلے ہی پیدا کی جا رہی ہے لیکن بہت سے لوگوں کی جیب میں اسے خریدنے کے پیسے نہیں ہیں! واشنگٹن پوسٹ کے مطابق امریکہ میں کل غذا کا 40 فیصد ہر سال ’’ضائع‘‘ ہوجاتا ہے۔ ’’ضائع‘‘ ہوجانے والی اس خوراک کا بڑا حصہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے گوداموں یا سپر سٹورز کی الماریوں میں پڑا پڑا ’’ایکسپائر‘‘ ہوجاتا ہے یا پھر قیمتیں بلند رکھنے کے لئے دانستہ طور پر ’’ڈمپ‘‘ کر دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف اسی امریکہ میں غذائی عدم تحفظ کا شکار پانچ کروڑ لوگ مضر صحت یا باسی خوراک کھانے پر مجبور ہیں۔ اقوام متحدہ کے مطابق عالمی سطح پر دو ارب لوگ غذائی عدم تحفظ جبکہ اسی کروڑ شدید غذائی قلت کا شکار ہیں۔

ان تمام اعداد و شمار کو مد نظر رکھتے ہوئے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ منافع پر مبنی پیداوار کا موجودہ طریقہ کار کرہ ارض کو زندگی کے لئے ناقابل اقامت بناتا چلا جا رہا ہے اور اگر سرمایہ داری کو اکھاڑ پھینکا نہیں جاتا تو ماحول کی بربادی کے تباہ کن اثرات مستقبل قریب میں ہی واضح ہونے لگیں گے۔ لیکن ماحولیات کے بچاؤ کے لئے کام کرنے والی تنظیموں اور گروہوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ اس نظام کی حدود میں رہتے ہوئے محض تنقید اور پند و نصائح کے ذریعے یہ گھمبیر مسئلہ حل کرنا چاہتے ہیں۔ جتنی بھی کانفرنسیں اور معاہدے کروالئے جائیں، سامراجی رہنما ’’ماحول کی حفاظت کے لئے اقدامات‘‘ پر جتنا بھی ’’زور‘‘ دیتے رہیں، جب تک معیشت، سیاست، ریاست اور میڈیا پر مٹھی بھر

سرمایہ دار قابض ہیں ماحولیات کی تباہی بڑھتی ہی چلی جائے گی۔اس نظام کی قوت محرکہ انسان کی ضرورت یا بھلائی نہیں بلکہ منافع اور شرح منافع کی ہوس ہے۔تیل سے وابستہ سامراجی اجارہ داریاں ''سول سوسائٹی'' کی اپیلوں اور وعظ و نصیحت سے متاثر ہوکر ''ماحول دوست'' بن سکتی ہیں، نہ ہی منافع کے ایک ایک روپے کا حساب رکھنے والے سرمایہ دار ''اچھا'' بن کر کروڑوں اربوں ڈالر صنعتی فضلے کی صفائی کے آلات اور ''گرین انرجی'' پر خرچ کر سکتے ہیں۔الیکٹرک کار سے لے کر توانائی کے متبادل ذرائع تک، عالمی معیشت کو کنٹرول کرنے والی یہ چند درجن ملٹی نیشنل کمپنیاں ہر اس ریسرچ اور تکنیک کو دبا دیتی ہیں جو ان کے منافعوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔اگر کوئی کارپوریشن یا سرمایہ دار ماحولیات کی حفاظت کو مدنظر رکھتے ہوئے پیداوار کرتا بھی ہے تو اسے اپنی شرح منافع کو برقرار رکھنے کے لئے مصنوعات کی قیمتوں میں اضافہ کرنا پڑے گا اور وہ لامحالہ طور پر منڈی سے باہر ہو جائے گا۔ یہ بحیثیت مجموعی پورے نظام کا مسئلہ ہے جو انفرادی اقدامات اور مہمات سے کبھی حل نہیں ہوسکتا۔

فطرت صرف خام مال کے حصول کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ ایک پیچیدہ نظام ہے جس کا ایک حصہ خود انسان بھی ہے۔انسان کی فوقیت یہ ہے کہ وہ ٹیکنالوجی اور ذرائع پیداوار کے ذریعے فطرت پر قابو پانے کی سعی کرتا ہے۔نسل انسان کی ترقی کی تاریخ دراصل فطرت کو مسخر کرنے کی تاریخ ہے لیکن فطرت کو مسخر کرنا اور اسے مسخ کرنا دو متضاد عمل ہیں۔ ٹیکنالوجی آج اس نہج پر ہے کہ انسان کے تباہ کن اقدامات اس سیارے پر سے زندگی کا ہی خاتمہ کر سکتے ہیں۔ یہ بربادی ناقابل احتراز بہرحال نہیں ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ معیشت کا یہ نظام کسی شعوری منصوبہ بندی کی بجائے منڈی کی انارکی پر قائم ہے۔حالات متقاضی ہیں کہ اس نظام کو قصہ ماضی بناتے ہوئے سماجی اور معاشی ارتقا کو ایک قدم آگے بڑھایا جائے۔سولر انرجی، ونڈ انرجی، پن بجلی اور حالیہ دنوں میں 'نیوکلیئر فیوژن' کے کامیاب تجربات سمیت کئی متبادل طریقے موجود ہیں جن کے ہوتے ہوئے توانائی کے حصول کے لئے ایک لیٹر تیل جلانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔وہ ٹیکنالوجی اور ذرائع موجود ہیں جن کے تحت دیرپا اشیائے صرف اور ضروریات زندگی دنیا کے ہر انسان کو فراہم کی جا سکتی ہیں۔کمی ہے تو منافع کی ہوس سے پاک اس سوشلسٹ منصوبہ بند معیشت کی جو ہزاروں لاکھوں سالوں کی انسانی

محنت کی ان حاصلات کونسل انسان کی ضرورت اورخوشحالی کے لئے بروئے کار لاسکتی ہے۔

سوشلزم اور خواتین

سرمایہ دارانہ نظام کے تحت محنت کش طبقات کی خواتین دوہرے جبرواستحصال کا شکار ہیں۔ بالخصوص پاکستان جیسے پسماندہ سماجوں میں طبقاتی استحصال کے ساتھ ساتھ مردانہ برتری اور جنسی شاونزم پر مبنی رویوں، اقدار اور روایات نے خواتین کی اکثریت کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ یہ درست ہے کہ ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک کی خواتین نے کئی صدیوں پر مبنی جدوجہد کے ذریعے بہت سی آزادیاں اور حقوق حاصل کئے ہیں لیکن آزادی نسواں وہاں بھی ادھوری ہے، پدرشاہی کی جکڑ اور جبر موجود ہے اور کئی حوالوں سے مغربی معاشروں کی خواتین کی زندگیاں یہاں سے زیادہ اذیت ناک ہیں۔ جب بھی جنسی بنیادوں پر جبرواستحصال اور خواتین کے حقوق کی بات آتی ہے تو بالعموم دو رجحانات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایک طرف 'لبرلزم' کی سوچ ہے، جو زیادہ تر این جی اوز اور نام نہاد 'سول سوسائٹی' میں پائی جاتی ہے اور خواتین کی آزادی کو مغربی لباسوں، میک اپ، ڈرائیونگ اور فیشن وغیرہ جیسے ایشوز سے جوڑتی ہے۔ اُن کی نظر میں بالائی مڈل کلاس کی خواتین کے ''مسائل'' ہی اِس ملک کی تمام خواتین کے مسائل ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہاں خواتین کی وسیع اکثریت مناسب غذا، صاف پانی، رہائش اور صحت وصفائی کی بنیادی سہولیات سے ہی محروم ہے۔ حکومت پاکستان کے اپنے غذائی سروے کے مطابق 51 فیصد حاملہ خواتین جبکہ 50.4 فیصد غیر حاملہ خواتین خون کی کمی کا شکار ہیں۔ وٹامنز اور معدنیات کی کمی کے اعداد وشمار اِس سے بھی زیادہ المناک ہیں۔ اِسی طرح تقریباً 50 فیصد بچوں کی ذہنی وجسمانی نشوونما ہی نامکمل ہے۔ 'حقوقِ نسواں' کی علمبردار این جی اوز اور لبرل حلقے ایسے خوفناک حقائق پر بات کرنے سے گریزاں ہیں کیونکہ یہ بحث پورے نظام پر ہی سوالیہ نشان لگا دیتی ہے۔ لبرلزم بنیادی طور پر سرمایہ داری کا کلاسیکی نظریہ ہے اور طبقاتی غلامی پر مبنی نظام کی نمائندگی کرنے والے کسی بھی نظریئے کے مطابق 'آزادی' کا مطلب غلام بننے یا بنانے، استحصال کرنے یا کروانے کی آزادی ہی ہوسکتا ہے۔ 'آزاد منڈی' کے اِس نظریئے کی رو سے عورت کی حیثیت بھی منڈی کی جنس سے زیادہ نہیں ہے جسے اپنا جسم بیچنے (چاہے اس کی شکل کوئی بھی ہو) کی 'آزادی' حاصل ہونی چاہئے۔ لبرلزم کے

برعکس مذہبیت یا بوسیدہ روایات پر مبنی قدامت پرستی ہے جو تقدس، پردے یا 'غیرت' وغیرہ کے نام پر عورت کو چادر اور چار دیواری میں قید کر کے سماج کی ہر سرگرمی اور ہر شعبے سے کاٹ دینا چاہتی ہے۔ اس کے نزدیک عورت کی اپنی کوئی خواہش، کوئی چاہت، کوئی مرضی و منشا نہیں ہونی چاہئے اور اسی میں عورت کی 'نجات' مضمر ہے۔ لیکن محنت کش طبقات کے پاس اتنی سکت نہیں ہوتی کہ عورت کو چار دیواری تک محدود رکھ کے گھر چلایا جاسکے۔ ایسے میں غریب طبقات کی خواتین کو اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے ناگزیر طور پر اجرتی محنت کرنی پڑتی ہے۔ کھیتوں کھلیانوں، فیکٹریوں یا امرا کے گھروں میں برقعے پہن کر مشقت نہیں کی جاسکتی۔ پچھلی کچھ دہائیوں سے درمیانے طبقات میں برقعے وغیرہ کا رجحان بڑھا ہے جو خواتین میں عدم تحفظ کے احساس کی غمازی کرتا ہے۔ لیکن قدامت پرستوں کے بیہودہ دلائل کے برعکس یہ رجحان خواتین کو محفوظ یا مضبوط کرنے کی بجائے انہیں نفسیاتی اور سماجی طور پر مزید کمزور کرتا ہے۔ ہمارے جیسے معاشروں میں سرمایہ داری کے ارتقا نے قدامت پرستی کو ختم کرنے کی بجائے زیادہ زہریلا اور وحشت ناک بنا دیا ہے۔ درحقیقت ملائیت اور لبرلزم ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں، ایک ہی نظام کے رکھوالے ہیں اور ان کے تحت عورت کا استحصال مختلف یا متضاد طریقوں سے جاری رہتا ہے۔

قومی سوال کی طرح خواتین کے حقوق اور آزادی کے سوال کو جب تک طبقاتی بنیادوں پر نہ سمجھا جائے کوئی حقیقت پسندانہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ سرمایہ داری میں نہ صرف عورت کی حیثیت کا تعین اُس کے طبقے اور دولت سے ہوتا ہے بلکہ آزادی نسواں کے معانی بھی مختلف طبقات کی خواتین کے لئے بالکل مختلف ہیں۔ یہاں بالادست طبقات کی خواتین نہ صرف اپنی ملازماؤں بلکہ ملازموں کو بھی بدترین تضحیک اور تحقیر کا نشانہ بناتی ہیں۔ کیا تپتی دھوپ میں سڑک پر مشقت کرتی عورت اپنے سامنے سے لاکھوں کروڑوں روپے کی ایئر کنڈیشنڈ گاڑی میں جاتی عورت کے 'برابر' ہے؟ کیا دونوں کے مسائل اور مفادات ایک ہیں؟ مسئلہ طبقاتی ہے۔ سرمایہ دار طبقات کی خواتین کے لئے 'آزادی' کا مطلب اپنے طبقے کے مردوں کے شانہ بشانہ محنت کش مرد و خواتین کا استحصال کرنے کی آزادی ہے۔ اِن خواتین کے مفادات محنت کش خواتین سے مختلف ہی نہیں متضاد ہیں اور وہ سرمایہ دارانہ نظام پر ضرب لگانے والی ہر تبدیلی کی مخالفت کریں گی۔ کیونکہ اپنے طبقے کے

مردوں کے مقابلے میں اُن کی حیثیت کچھ بھی ہو، اِس سماج میں اُن کی بالا دست حیثیت اور پُر تعیش 'لائف سٹائل' اسی نظام سے مشروط ہے جو محنت کش مرد و خواتین کے استحصال پر مبنی ہے۔ اِسی طرح آج کل بہت سے سوشلسٹ خواتین و حضرات نے سوشلزم کو فیـمـنـزم کیساتھ جوڑ کر عجیب و غریب اور متضاد نوعیت کی اصطلاحات بھی ایجاد کر لی ہیں۔ یہ بھی ایک المیہ ہے کہ 8 مارچ، جسے 'محنت کش خواتین' کے عالمی دن کے طور پر منانے کا آغاز 1909ء میں دوسری انٹرنیشنل نے کیا تھا، رفتہ رفتہ محض 'خواتین' کا عالمی دن بن گیا ہے۔ یہاں فیـمـنـزم کی بھی بہت سی تعریفیں اور توجیہات موجود ہیں۔ لیکن انقلابی سوشلزم انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال اور محکومی کی ہر شکل کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتا ہے اور اس کے ثبوت کے لئے اپنے ساتھ کوئی دوسری اصطلاح جوڑنے کا مرہونِ منت نہیں ہے۔ مزید برآں محنت کش طبقے کی جڑت میں دراڑیں ڈالنے والا ہر تعصب اور تقسیم ردِ انقلابی کردار کی حامل ہوتی ہے اور سرمائے کی حاکمیت کو تقویت دیتی ہے، جس کے خلاف بے رحم جدوجہد کی جانی چاہئے۔

عورت کی محکومی کا آغاز سماج کی طبقات میں تقسیم کیساتھ ہوا تھا۔ اِس کا خاتمہ بھی طبقات کے خاتمے سے مشروط ہے جو سوشلسٹ انقلاب کے بغیر ممکن نہیں۔ ایک سوشلسٹ انقلاب عورت کی آزادی اور نجات کو نہ صرف اپنے ایجنڈے پر رکھے گا بلکہ اِسے سوشلزم اور کمیونزم کی تعمیر کی بنیادی شرط بنائے گا۔ لینن کی کامریڈ اور دوست انیسا آرمنڈ نے تو یہاں تک کہا تھا کہ ''اگر کمیونزم کے بغیر عورت کی آزادی کا تصور محال ہے تو عورت کی آزادی کے بغیر کمیونزم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔'' اِس حوالے 1917ء کا انقلابِ روس آج بھی مشعل راہ ہے جس کا آغاز ہی ٹیکسٹائل کی محنت کش خواتین نے کیا تھا۔ بالشویک پارٹی کی قیادت میں محنت کشوں کے اقتدار پر قبضے اور سوویت جمہوریہ کے قیام کے بعد جنسی بنیادوں پر اجرتوں میں فرق کا خاتمہ کیا گیا۔ خواتین کو نہ صرف ووٹ ڈالنے کا حق دیا گیا بلکہ سیاست سمیت ہر شعبے میں ان کی بھرپور شرکت کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ اِسی طرح خواتین کو طلاق دینے کا اختیار بھی دیا گیا۔ زچگی کے دوران خواتین کو اجرت کیساتھ آٹھ ہفتوں کی چھٹی دینے کا قانون متعارف کروایا گیا۔ یہ وہ حقوق تھے جو انتہائی ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک میں بھی خواتین کو کئی دہائیوں بعد تک حاصل نہ ہو سکے۔ لینن نے جون

1919ء میں بالکل بجا لکھا تھا کہ ''خواتین کی حیثیت میں بہتری کے لئے جو کچھ ہم نے ایک سال میں کیا ہے کوئی جمہوری پارٹی کسی انتہائی ترقی یافتہ بورژوا جمہوریت میں پچھلی کئی دہائیوں کے دوران اُس کا ایک سواں حصہ بھی نہیں کر پائی ہے۔'' اُس نے مزید لکھا، ''گھریلو مشقت عورت کا دم گھونٹتی ہے، اُس کی تضحیک اور تحقیر کرتی ہے، اُسے باورچی خانے اور نرسری سے باندھ کے رکھ دیتی ہے۔ وہ اپنی محنت کو بہیمانہ حد تک غیر پیداواری، حقیر، اعصاب کو تھکا اور کچل دینے والی بیگاری میں ضائع کرتی رہتی ہے۔ خواتین کی حقیقی آزادی اور حقیقی کمیونزم کا آغاز تبھی ہوگا جب برسراقتدار پرولتاریہ کی قیادت میں اِس حقیر گھر داری کے خلاف بھرپور جدوجہد شروع کی جائے گی، بلکہ یوں کہہ لیں کہ جب اِسے بڑے پیمانے کی سوشلسٹ معیشت میں ضم کرنے کا آغاز کیا جائے گا۔'' چنانچہ خواتین کو گھریلو مشقت سے نجات دلانے کے لئے اشترا کی باورچی خانوں، لانڈریوں اور کنڈر گارٹن اداروں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ سوویت یونین میں 1970ء کی دہائی میں 75 فیصد اساتذہ، 95 فیصد لائبریرین، 98 فیصد نرسز اور 75 فیصد ڈاکٹر خواتین تھیں۔ خواتین پی ایچ ڈی سکالرز اور سائنسدانوں کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ عصمت فروشی ناپید تھی۔ لیکن سرمایہ داری کی بحالی کے بعد سے یہ لعنت سابقہ سوویت ممالک (بالخصوص مشرقی یورپ اور وسط ایشیا) کی پہچان بن چکی ہے۔

ریپ، تیزاب گردی، جنسی ہراسانی اور غیرت کے نام پر قتل کے بڑھتے ہوئے واقعات ایک ایسے نظام کی ناگزیر پیداوار ہیں جو تاریخی طور پر متروک ہو کر سماج کو آگے بڑھانے سے قاصر ہو چکا ہے۔ ٹھہراؤ ہمیشہ تعفن کو جنم دیتا ہے۔ معاشرے جب آگے نہیں بڑھ پاتے تو ناگزیر طور پر وحشت اور بربریت میں غرق ہونے لگتے ہیں۔ یہاں خواتین کی حفاظت کے لئے بہت قوانین بنے ہیں اور شاید آگے بھی بنتے رہیں گے۔ ہم ایسی قانون سازیوں کی مخالفت نہیں کرتے۔ لیکن ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کرتے ہیں قانون کبھی بھی مادی حقائق سے بالا نہیں ہو سکتا۔ یہاں انصاف بھی پیسے سے ہی خریدا جا سکتا ہے۔ صرف محنت کش طبقہ ہی اِس نظام کی ذلتوں اور بربادیوں سے نسل انسان کو نجات دلا سکتا ہے اور محنت کش خواتین کی بھرپور شرکت کے بغیر سوشلسٹ انقلاب کبھی فتحیاب نہیں ہو سکتا۔ آزادی نسواں آخری تجزیئے میں طبقاتی جبر و استحصال سے آزادی کی متقاضی ہے۔ سوشلزم

ہی ہر قسم کی غلامی کی بیڑیاں توڑ کر عورت کو حقیقی معنوں میں معاشی اور سماجی طور پر آزاد کر سکتا ہے۔

کیا سوشلسٹ انقلاب پرامن ہو سکتا ہے؟

تشدد اور خون خرابہ کسی عظیم انقلاب کا مقصد نہیں ہو سکتا۔ ایک پرامن انقلاب کے ذریعے سرمایہ داری کے خاتمے کی خواہش تو ضرور کی جا سکتی ہے لیکن کمیونسٹ کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوتے۔ اِس حوالے سے سب سے پہلے یہ حقیقت جاننے کی ضرورت ہے کہ انسانی تاریخ کا کوئی بھی حکمران طبقہ رضا کارانہ طور پر اپنے حقوق سے دستبردار نہیں ہوا ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ انقلاب تو دور کی بات، محنت کش جب کبھی اِس نظام میں حاصل قانونی حقوق کا مطالبہ بھی کرتے ہیں تو انہیں اکثر بدترین جبر و تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ ریاست محنت کشوں پر منظّم جبر کے ادارے کے سوا اور کیا ہوتی ہے؟ چنانچہ یہ بات خارج از امکان ہے کہ ایک انقلابی صورتحال میں جب محنت کش طبقہ اقتدار پر قبضہ کرنے کی طرف بڑھے گا تو حکمران طبقات مزاحمت نہیں کریں گے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایسے حالات میں جب استحصالی طبقات کی مراعات خطرے میں پڑتی ہیں تو وہ وحشت اور بربریت کی کسی بھی نہج تک جا سکتے ہیں۔

ایک انقلاب آخری تجزیے میں اقتدار پر قبضے کے لئے دو متحارب طبقات کے درمیان طاقت کا مقابلہ ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسی کیفیت میں محنت کش طبقے کو نہ صرف اپنے دفاع کا پورا حق حاصل ہے بلکہ انقلاب دشمن عناصر کو کچلنے کے بے رحم اقدامات ہی کم سے کم خون خرابے کی ضمانت بن سکتے ہیں۔ جیسا کہ لیون ٹراٹسکی نے واضح کیا تھا کہ ایک سنجیدہ جدوجہد میں غیر مناسب وقت پر رحم دلی دکھانے سے بڑا ظلم کوئی نہیں ہوتا۔ اگر ایک انقلابی صورتحال میں محنت کش طبقہ کسی تذبذب کا مظاہرہ کرتا ہے تو حکمران طبقات کے لئے انقلاب کو کچلنا آسان ہو جاتا ہے جس کے بعد وہ خون کی ندیاں بہا دیتے ہیں۔ ادھورا انقلاب کرنے والے اپنی قبر خود کھودتے ہیں اور ناکام انقلابات کی تاریخ انقلابیوں کے قتل عام سے عبارت ہوتی ہے۔ چنانچہ محنت کش طبقہ نظریاتی اور تنظیمی طور پر جس قدر تیار ہوگا حکمران طبقات کی مزاحمت کو اتنی ہی سرعت سے کچلنے کے قابل ہوگا اور انقلاب اسی قدر 'پرامن' ہوگا۔

یہاں ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ ریاست کے پاس محنت کشوں کی بغاوت کو کچلنے کا سب سے

منظّم، جابر اور حتمی اوزار فوج ہی ہوتی ہے، جسے پولیس وغیرہ کی ناکامی کے بعد سڑکوں پر لایا جاتا ہے۔لیکن فوج بذات خود طبقاتی سماج کا ہی عکس ہوتی ہے۔فوج کے سپاہی محنت کش گھرانوں سے ہی آتے ہیں اور آخری تجزیئے میں وردی والے محنت کش ہی ہوتے ہیں جنہیں سخت ڈسپلن کی جکڑ رکھا جاتا ہے۔ عام حالات میں افسران کی حکم عدولی کا مطلب سپاہیوں کے لئے موت یا کسی دوسری نوعیت کی عبرت ناک تعزیری کاروائی سے کم نہیں ہوتا۔لیکن ایک انقلاب جیسے غیر معمولی حالات، جب لاکھوں کروڑوں محنت کش مروجہ استحصالی رشتوں اور اقدار کو چیلنج کر رہے ہوتے ہیں، سپاہیوں کے شعور کو بھی جھنجوڑ ڈالتے ہیں اور فوج میں طبقاتی تقسیم واضح ہونے لگتی ہے۔ سپاہیوں کے مزدوروں سے جا ملنے اور اپنے ہتھیاروں کے رخ موڑ دینے کے اِسی مرحلے کے بارے میں لیون ٹراٹسکی نے 'انقلابِ روس کی تاریخ' میں لکھا تھا: ''یہ مرحلہ ہر انقلاب میں ناگزیر ہوتا ہے۔لیکن یہ ہمیشہ بالکل نیا لگتا ہے اور درحقیقت ہر بار مختلف انداز میں رونما ہوتا ہے: جو اس کے بارے میں پڑھتے اور لکھتے ہیں وہ بھی جب اسے دیکھتے ہیں تو پہچان نہیں پاتے۔'' وہ مزید وضاحت کرتا ہے کہ ''سپاہی اُسی قدر اپنی سنگینوں کا رخ موڑ دینے اور عوام سے مل جانے کو تیار ہوں گے جس قدر اُنہیں یقین ہوگا کہ باغی واقعی بغاوت کر رہے ہیں، کہ یہ کوئی ایسا مظاہرہ نہیں ہے جس کے بعد اُنہیں بیرکوں میں واپس جا کر رپورٹ دینی ہوگی، کہ یہ زندگی موت کی جدوجہد ہے، کہ اگر وہ ساتھ مل گئے تو عوام جیت سکتے ہیں اور یہ کہ فتح نہ صرف اُنہیں بغاوت کی سزا سے بچائے گی بلکہ سب کے حالات کو بہتر کرے گی۔ دوسرے الفاظ میں سپاہیوں کو انقلابی اُسی وقت جھنجوڑ سکتے ہیں جب وہ خود ہر قیمت پر، حتیٰ کہ خون کی قیمت پر بھی فتح حاصل کرنے کو تیار ہوں۔ بلند عزم کبھی غیر مسلح نہیں رہ سکتا، نہ رہے گا۔'' یوں پرولتاریہ کی تحریک جتنی منظّم، باشعور اور جارحانہ ہوتی ہے، یہ فیصلہ کن عمل اتنا ہی تیز اور آسان ہو جاتا ہے۔ 1917ء کے انقلابِ روس کی کامیابی میں بھی سپاہیوں کی مزدوروں سے طبقاتی جڑت فیصلہ کن اہمیت کی حامل تھی، جس نے پہلے فروری میں زار شاہی کا تختہ اُلٹا اور پھر 9 مہینے بعد نومبر میں محنت کشوں کے اقتدار پر قبضے پر منتج ہوئی۔ بالخصوص 7 نومبر (پرانے روسی کیلنڈر کے مطابق 25 اکتوبر) کی سرکشی میں سرے سے کوئی خون نہیں بہا کیونکہ اِس کی منصوبہ بندی ایک ایسی انقلابی پارٹی نے کی تھی جس نے مزدوروں، سپاہیوں اور غریب

کسانوں کا اعتماد اور حمایت جیت لی تھی اور نتیجتاً انتہائی منظّم انداز میں کسی غیر ضروری خون خرابے کے بغیر اقتدار پر قبضہ کرنے کے قابل تھی۔ لیکن بالشویک انقلاب کا ایک تاریخی سبق یہ بھی ہے کہ اصل خونریزی اُس وقت شروع ہوئی جب 21 سامراجی ممالک نے انقلاب کو کچلنے کے لئے روس پر چڑھائی کردی، جسے شکست دینے میں ایک بار پھر سامراجی ممالک کے مزدوروں اور سپاہیوں کی ہمدردی اور طبقاتی جڑت نے اہم کردار ادا کیا۔

انقلابی پارٹی کی ضرورت

سوشلسٹ انقلاب کا ہراول دستہ پرولتاریہ ہوتا ہے اور پرولتاریہ کا ہراول دستہ انقلابی پارٹی ہوتی ہے۔ انقلابی پارٹی کا مقصد محنت کش طبقے کی بغاوت کو مجتمع اور منظّم کر کے سوشلسٹ انقلاب کی سمت میں گامزن کرنا ہوتا ہے۔ انقلابِ روس کے قائد لیون ٹراٹسکی نے انقلابی پارٹی کو ایسے 'پسٹن باکس' سے تشبیہ دی تھی جس کے بغیر محنت کش طبقے کی توانائی ہوا میں زائل ہوجاتی ہے۔ لیکن اِسی توانائی یا بھاپ کو اگر انقلابی پارٹی کی شکل میں پسٹن باکس میسر آجائے تو تاریخ کا وہ انجن معرض وجود میں آتا ہے جو پورے سماج کو آگے بڑھاتا ہے۔ تنظیمی حوالے سے بات کی جائے تو ایک انقلابی پارٹی محنت کش طبقے کا دماغ ہوتی ہے جو اس کی حرکات کو ایک نظم میں لا کر مربوط کرتی ہے۔ یہ محنت کش طبقے کی یادداشت کا کردار ادا کرتی ہے اور اس کی ماضی کی تمام تر جدوجہد سے عمومی نتائج اخذ کرتی ہے۔

ایک انقلابی پارٹی سب سے پہلے ایک نظریہ ہوتی ہے۔ اِسی نظریئے کی بنیاد پر اس کا پروگرام، لائحہ عمل اور تنظیمی ڈھانچے تشکیل پاتے ہیں۔ پرولتاریہ کا انقلابی نظریہ چونکہ مارکسزم ہے لہٰذا ایک مارکسی پارٹی ہی پرولتاری انقلاب کی قیادت کا فریضہ سرانجام دے سکتی ہے۔ لیکن انقلابی پارٹی کی تعمیر ایک مشکل اور صبر آزما کام ہے اور انقلابی پارٹیاں انقلابات کے دوران تعمیر نہیں ہوتیں بلکہ انقلاب کا یہ اوزار انتہائی کٹھن اور ناموافق حالات کی بھٹی میں پک کر تیار ہوتا ہے۔ اس کی قیادت کو مشکل وقتوں، نامساعد حالات، ریاستی جبر و تشدد، غلیظ پراپیگنڈے اور بہتانوں کے کڑے امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ تاہم انقلابی کیفیات میں انقلابی پارٹی کو وہ حالات میسر آتے ہیں جس میں وہ تیزی سے نمو پاسکتی ہے اور محنت کش طبقے کی وسیع تر پرتوں کو جوڑتے ہوئے

ایک دیوہیکل وجود کیساتھ منظر عام پر آسکتی ہے۔

ماضی کے انقلابات میں اقتدار ایک اقلیتی طبقے سے دوسرے اقلیتی طبقے تک منتقل ہوتا آیا ہے۔ مثلاً غلام داری کے آقاؤں سے جاگیرداروں اور پھر جاگیرداروں سے سرمایہ داروں کو۔ لیکن سوشلسٹ انقلاب انسانی تاریخ کا وہ واحد انقلاب ہے جس میں اقتدار ایک اقلیت سے اکثریت کو منتقل ہوتا ہے۔ یہ تاریخی تبدیلی ایک شعوری مداخلت کے بغیر ممکن نہیں ہے اور یہ عمل ایک انقلابی پارٹی کے ذریعے ہی مکمل ہوسکتا ہے۔ جدید تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جب محنت کش طبقے نے بھرپور بغاوت کر کے سرمایہ داری کو مفلوج کر دیا لیکن انقلابی پارٹی کی عدم موجودگی میں انقلاب اصلاحات میں زائل ہوگیا یا پھر کچل دیا گیا۔ خود پاکستان میں 69-1968ء کے انقلاب کا یہی المیہ تھا جس کا خمیازہ یہاں کے محنت کش آج تک بھگت رہے ہیں۔ چنانچہ آج انقلابیوں کا اولین فریضہ ایک انقلابی پارٹی کی تعمیر ہے جس کے لئے انقلابی مارکسزم کے نظریات کو محنت کشوں اور نوجوانوں تک لے جا کر کیڈر سازی کی ضرورت ہے۔ یہی کیڈر ایک انقلابی پارٹی کے ڈھانچوں میں منظّم ہوکر پرولتاریہ کے 'جنرل سٹاف' کا کردار ادا کرتے ہوئے سوشلسٹ انقلاب کو فتح سے ہمکنار کر سکتے ہیں۔

*****

ضمیمہ جات

مارکسزم کے تین سرچشمے اور تین اجزائے ترکیبی

(The Three Sources and Three Component Parts of Marxism)

مارکس کی تعلیمات تمام مہذب دنیا میں سرکاری اور لبرل، دونوں قسم کی بورژوا سائنس کی نفرت اور عداوت کو بیدار کر دیتی ہیں۔ بورژوا سائنس کی نظر میں مارکسزم ایک ''مہلک فرقہ'' ہے۔ اس کے سوا اور کسی قسم کے رویے کی امید بھی نہیں کی جا سکتی کیونکہ ایک ایسے سماج میں ''غیر جانبدار'' سماجی سائنس کا وجود ناممکن ہے جس کی بنیاد ہی طبقاتی کشمکش پر مبنی ہو۔ تمام سرکاری اور لبرل سائنس کسی نہ کسی طرح سے اجرتی غلامی کا دفاع کرتی ہے، جبکہ مارکسزم نے تو اس غلامی کے خلاف بے رحم جنگ چھیڑ رکھی ہے۔ اجرتی غلامی کے سماج میں سائنس سے یہ امید رکھنا کہ وہ غیر جانبداری برتے گی، بالکل ایسی ہی نادانی ہے جیسے کارخانہ دار سے اس سوال پر غیر جانبداری کی امید رکھنا کہ کیوں نہ سرمائے کا منافع کم کر کے مزدوروں کی اجرت بڑھا دی جائے۔

مگر بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ فلسفے اور سماجی سائنس کی تاریخ بالکل واضح کرتی ہے کہ مارکسزم میں ''فرقہ پرستی'' (Sectarianism) قسم کی کوئی چیز ان معنوں میں موجود نہیں ہے کہ یہ کوئی تنگ نظر اور جامد نظریہ ہے جو دنیا کے تمدن کے ارتقا کی روش سے الگ تھلگ ابھرا ہے۔ اس کے برعکس مارکس کی بصیرت خاص طور پر اس حقیقت میں مضمر ہے کہ اس نے ان سوالوں کا جواب تیار کیا جو نسل انسان کے سب سے ممتاز دماغوں کی جانب سے اٹھائے گئے تھے۔ مارکس کی تعلیمات فلسفے، سیاسی معاشیات (Political Economy) اور سوشلزم کے عظیم ترین نمائندوں کی تعلیمات کا براہ راست اور فوری تسلسل ہیں۔

مارکس کا نظریہ طاقتور ہے کیونکہ وہ سچا ہے۔ یہ نظریہ مکمل اور مربوط ہے اور لوگوں کو ایک ایسا باضابطہ عالمی نقطہ نظر مہیا کرتا ہے جو توہم پرستی، رجعت اور بورژوا جبر کے دفاع کی ہر شکل سے ناقابل مصالحت ہے۔ یہ نظریہ ان بہترین خیالات کا جائز وارث ہے جو بنی نوع انسان نے انیسویں صدی کے جرمن فلسفے، انگریزی سیاسی معاشیات اور فرانسیسی سوشلزم کی صورت میں تخلیق کئے تھے۔

مارکسزم کے انہی تین سرچشموں، جو اس کے اجزائے ترکیبی بھی ہیں، کی ہم مختصراً وضاحت کریں گے۔

I

مارکس ازم کا فلسفہ مادیت (Materialism) ہے۔ یورپ کی جدید تاریخ کے تمام ادوار میں اور بالخصوص اٹھارویں صدی کے آخر میں فرانس میں، جہاں قرون وسطیٰ کی ہر قسم کی خرافات کے خلاف، اداروں اور نظریات میں جاگیرداری کے خلاف فیصلہ کن جدوجہد کی گئی، مادیت نے ثابت کر دیا ہے کہ یہی ایک ایسا فلسفہ ہے جو مربوط اور بااصول ہے، جو طبعی سائنس کی تمام تعلیمات سے مطابقت رکھتا ہے اور توہم پرستی کا مخالف ہے۔ چنانچہ جمہوریت کے دشمنوں نے اپنا سارا زور ہمیشہ مادیت کی ''تردید''، اس کی بیخ کنی اور اسے بدنام کرنے پر لگایا ہے۔ انہوں نے فلسفیانہ خیال پرستی (Idaelism) کی مختلف شکلوں کی وکالت کی ہے جو ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں مذہب کے دفاع یا اس کی حمایت کے مترادف تھی۔

مارکس اور اینگلز نے نہایت ثابت قدمی سے فلسفیانہ مادیت کا دفاع کیا اور بار بار وضاحت کی کہ اس بنیاد سے انحراف کس قدر سنگین غلطی ہے۔ ان کے نظریات اینگلز کی تصانیف 'لڈوگ فائر باخ' اور 'اینٹی ڈیورنگ' میں سب سے واضح اور جامع انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ یہ تصانیف 'کمیونسٹ مینی فسٹو' کی طرح ہر طبقاتی شعور رکھنے والے محنت کش کے لئے بنیادی ہدایت نامے کا درجہ رکھتی ہیں۔

لیکن مارکس نے اٹھارویں صدی کی مادیت پر بس نہیں کی: اس نے فلسفے کو آگے بڑھا کر ایک بلند تر مقام پر پہنچایا۔ اس نے فلسفے کو جرمن کلاسیکی فلسفے کی دریافتوں، بالخصوص ہیگل کے اُس

نظامِ فکر سے مالا مال کیا جس نے خود فائرباخ (Feuerbach) کے نظریہ مادیت کو جنم دیا تھا۔ سب سے کلیدی کارنامہ جدلیات (Dialectics) یعنی سب سے مکمل اور سب سے گہری شکل میں ارتقا کا نظریہ ہے۔ یہ انسانی علم کی اضافیت (Relativity) کا نظریہ ہے جو ہمیشہ سے ارتقا پذیر مادے کی عکاسی کرتا ہے۔ فرسودہ اور زوال پذیر خیال پرستی کی طرف ''نئی'' واپسی پر مبنی بورژوا فلسفیوں کی تعلیمات کے باوجود طبعی سائنس کی تازہ دریافتیں (ریڈیم، الیکٹران اور عناصر کی ایک دوسرے میں تبدیلی) حیرت انگیز حد تک مارکس کی جدلیاتی مادیت کی تصدیق کرتی ہیں۔

مارکس نے فلسفیانہ مادیت کو گہرائی اور نشوونما بخشتے ہوئے مکمل کیا اور فطرت کے ادراک کو انسانی سماج کے ادراک تک وسیع کر دیا۔ اُس کی تاریخی مادیت سائنسی فکر میں ایک عظیم کارنامہ تھا۔ تاریخ اور سیاست کے پہلے سے مروجہ نظریات پر جس انتشار اور من مرضی کا راج تھا اس کی جگہ غیر معمولی طور پر کامل اور ہم آہنگ سائنسی تھیوری نے لے لی، جو واضح کرتی ہے کہ کیسے پیداواری قوتوں کی بڑھوتری کے نتیجے میں سماجی زندگی کے ایک نظام میں سے ایک دوسرا زیادہ ترقی یافتہ نظام برآمد ہوتا ہے۔ مثلاً جاگیرداری میں سے سرمایہ داری کیونکر برآمد ہوئی۔

جیسے انسان کا علم اُس فطرت (یعنی ارتقا پذیر مادے) کی عکاسی کرتا ہے جو اس سے آزادانہ طور پر وجود رکھتی ہے، بالکل اسی طرح انسان کا سماجی علم (یعنی اس کے مختلف فلسفیانہ، مذہبی اور سیاسی خیالات اور نظریات وغیرہ) سماج کے معاشی نظام کی عکاسی کرتا ہے۔ سیاسی ادارے معاشی بنیاد پر کھڑے بالائی ڈھانچے ہوتے ہیں۔ مثلاً ہم دیکھ سکتے ہیں کہ جدید یورپی ریاستوں کی مختلف سیاسی شکلیں پرولتاریہ پر بورژوازی کے غلبے کو مضبوط کرنے کا کام سرانجام دیتی ہیں۔

مارکس کا فلسفہ اعلیٰ درجے کی فلسفیانہ مادیت ہے، جس نے نسلِ انسان، بالخصوص محنت کش طبقے کو آگاہی کا طاقتور اوزار عطا کر دیا ہے۔

II

یہ سمجھ لینے کے بعد کہ معاشی نظام ہی وہ بنیاد ہے جس پر سیاست کا بالائی ڈھانچہ کھڑا ہوتا ہے، مارکس نے اپنی سب سے زیادہ توجہ اس معاشی نظام کے مطالعے پر مرکوز کر دی۔ مارکس کی کلیدی تصنیف 'سرمایہ' (Capital) جدید سماج یعنی سرمایہ دار سماج کے معاشی نظام کے مطالعے

کے لئے وقف ہے۔

مارکس سے پہلے کلاسیکی سیاسی معاشیات برطانیہ میں مرتب ہوئی تھی، جو تمام سرمایہ دارانہ ملکوں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ ایڈم سمتھ اور ڈیوڈ ریکارڈو نے معاشی نظام کی چھان بین کر کے 'محنت کے نظریہ قدر' کی بنیاد رکھ دی تھی۔ مارکس نے اُن کے کام کو جاری رکھا۔ اُس نے اِس نظریئے کا ثبوت پیش کیا اور اسے تسلسل کیساتھ آگے بڑھایا۔ اُس نے واضح کیا کہ ہر جنس (Commodity) کی قدر کا تعین اس کی پیداوار پر صرف ہونے والی 'سماجی طور ضروری محنت کے وقت' کی مقدار سے ہوتا ہے۔

جہاں بورژوا معیشت دانوں نے چیزوں کے درمیان تعلق (ایک جنس کا دوسری سے تبادلہ) دیکھا وہاں مارکس نے انسانوں کے درمیان تعلق کو آشکار کیا۔ اجناس کا تبادلہ منڈی کے ذریعے انفرادی پیداکاروں (Producers) کے تعلق کا اظہار کرتا ہے۔ پیسہ اس بات کا اظہار ہے کہ یہ تعلق زیادہ سے زیادہ قریبی ہوتا جا رہا ہے اور الگ الگ پیداوار کرنے والوں کی ساری معاشی زندگی کو ناقابل علیحدگی طور پر ایک کُل میں جوڑ رہا ہے۔ سرمایہ اس تعلق میں مزید پیش رفت کا اظہار ہے: انسان کی قوتِ محنت بھی ایک جنس بن جاتی ہے۔ اجرتی مزدور اپنی قوتِ محنت کو زمین، فیکٹریوں اور آلاتِ محنت کے مالک کو بیچتا ہے۔ مزدور کام کے دن کا ایک حصہ اس لاگت کو پورا کرنے میں صرف کرتا ہے جو اسے اور اس کے خاندان کو زندہ رکھنے پر آتی ہے (یعنی اُس کی اجرت)، جبکہ دن کا دوسرا حصہ وہ بغیر اجرت کے کام کرتا ہے اور سرمایہ دار کے لئے قدر زائد (Surplus-Value) پیدا کرتا ہے، جو سرمایہ دار طبقے کے منافعے اور دولت کا ماخذ ہوتی ہے۔

قدر زائد کا نظریہ مارکس کے معاشی نظریئے کا بنیادی پتھر ہے۔

مزدور کی محنت سے پیدا ہونے والا سرمایہ' چھوٹے کاروباری لوگوں کو برباد اور بیروزگاروں کی فوج کھڑی کر کے مزدور کو ہی کچلتا ہے۔ صنعت میں بڑے پیمانے کی پیداوار کی فتح فوراً نظر میں آجاتی ہے لیکن یہی مظہر زراعت میں بھی دیکھا جا سکتا ہے، جہاں بڑے پیمانے کی سرمایہ دارانہ زراعت کی فوقیت بڑھتی جاتی ہے۔ مشینری کا استعمال بڑھتا جاتا ہے، مالیاتی سرمائے کی جکڑ میں

کسانوں کی معیشت زوال پذیر ہو جاتی ہے اور اپنی پسماندہ تکنیک کے بوجھ تلے غرق ہو جاتی ہے۔ زراعت میں چھوٹے پیمانے کی پیداوار کا زوال صنعت سے مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے، لیکن یہ زوال بہرحال ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔

چھوٹے پیمانے کی پیداوار کو تباہ کر کے سرمایہ محنت کی بار آوری (Productivity) کو بڑھاتا ہے اور بڑے سرمایہ داروں کی انجمنوں کو اجارہ دارانہ مقام عطا کرتا ہے۔ خود پیداوار زیادہ سے زیادہ سماجی ہوتی جاتی ہے۔ لاکھوں کروڑوں مزدور ایک باقاعدہ معاشی وجود میں ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں، لیکن اس اجتماعی محنت کی پیداوار پر مٹھی بھر سرمایہ دار قابض ہوتے ہیں۔ پیداوار کا انتشار، بحران، منڈیوں کا غضبناک تعاقب اور عوام کی زندگیوں کا عدم تحفظ شدت اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔

سرمائے پر محنت کشوں کا انحصار بڑھا کر سرمایہ دارانہ نظام محنت کی جڑت کی عظیم طاقت کو جنم دیتا ہے۔

مارکس نے اجناس پر مبنی بالکل ابتدائی معیشت، یعنی سادہ تجارت سے اس کی اعلیٰ اشکال یعنی بڑے پیمانے کی پیداوار تک سرمایہ داری کے ارتقا کا سراغ لگایا۔

اور نئے و پرانے تمام سرمایہ دارانہ ممالک کا تجربہ سال بہ سال محنت کشوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کے سامنے مارکسی نظریئے کی سچائی کو واضح طور پر آشکار کر رہا ہے۔ سرمایہ داری تمام دنیا میں فتح حاصل کر چکی ہے، لیکن یہ فتح محنت کی سرمائے پر فتح کا پیش خیمہ ہے۔

III

جب جاگیرداری کو اکھاڑ پھینکا گیا اور دنیا میں ''آزاد'' سرمایہ دارانہ سماج نمودار ہوا تو فوراً ہی واضح ہو گیا کہ اس آزادی کا مطلب محنت کش عوام پر جبر اور اُن کے استحصال کا نیا نظام تھا۔ اِس جبر کے خلاف احتجاج کے اظہار کے طور پر کئی قسم کے سوشلسٹ نظریات فوراً نمودار ہونے لگے۔ تاہم ابتدائی سوشلزم یوٹوپیائی یا خیالی سوشلزم تھا۔ وہ سرمایہ دارانہ سماج پر تنقید کرتا تھا، اس پر لعنت و ملامت کرتا تھا، اس کی بربادی اور ایک بہتر نظام کے خواب دیکھتا تھا اور امیروں کو اس بات پر قائل کرنے کی سخت کوشش کرتا تھا کہ استحصال ایک بداخلاقی اور بدکاری ہے۔

لیکن یوٹوپیائی سوشلزم حقیقی حل پیش کرنے سے قاصر تھا۔ وہ سرمایہ داری کے تحت اجرتی غلامی کی حقیقی نوعیت کی وضاحت کرنے سے عاری تھا۔ وہ سرمایہ دارانہ ارتقا کے قوانین کو آشکار کرنے یا پھر یہ واضح کرنے سے قاصر تھا کہ کونسی سماجی قوت ایک نئے سماج کی خالق بننے کے قابل تھی۔

اسی دوران پورے یورپ اور بالخصوص فرانس میں جاگیرداری کے انہدام کے ساتھ برپا ہونے والے طوفانی انقلابات نے زیادہ سے زیادہ واضح طور پر آشکار کیا کہ طبقاتی جدوجہد ہی تمام تر ارتقا کی قوت محرکہ ہے۔

جاگیردار طبقے کے خلاف سیاسی آزادی کی کوئی ایک بھی فتح سخت مزاحمت کے بغیر حاصل نہیں کی گئی تھی۔ سرمایہ دارانہ سماج کے مختلف طبقات کے درمیان زندگی موت کی لڑائی کے بغیر کوئی ایک بھی سرمایہ دارانہ ملک آزاد اور جمہوری بنیادوں پر استوار نہیں ہوا۔

مارکس کی عظیم بصیرت یہ ہے کہ اُس نے سب سے پہلے وہ سبق حاصل کیا جو عالمی تاریخ سکھاتی ہے اور پھر اس سبق کو مستقل مزاجی اور تسلسل سے منطبق کیا۔ اُس نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ طبقاتی جدوجہد کا نظریہ ہے۔

لوگ ہمیشہ سے سیاست میں فریب اور خود فریبی کے بے عقل شکار بنتے رہے ہیں اور اُس وقت تک بنتے رہیں گے جب تک کہ وہ یہ پتا چلانا نہ سیکھ لیں کہ تمام تر اخلاقی، مذہبی، سیاسی اور سماجی لفاظی، اعلانات اور وعدوں کے پیچھے کسی نہ کسی طبقے کے مفادات پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اصلاحات اور بہتری کے حامیوں کو پرانے نظام کے رکھوالے ہمیشہ بیوقوف بناتے رہیں گے، جب تک کہ وہ یہ حقیقت نہ جان لیں کہ ہر پرانا ادارہ، چاہے وہ کتنا ہی وحشیانہ اور گلا سڑا نظر آتا ہو، مخصوص حکمران طبقات کی قوتوں کی جانب سے جاری رکھا جاتا ہے۔ اور ان طبقات کی مزاحمت کو توڑنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ ہمارے اردگرد موجود سماج میں سے ہی وہ قوتیں تلاش کی جائیں جو ایسی طاقت تشکیل دے سکتی ہیں (اور اپنی سماجی حیثیت کے پیش نظر انہیں تشکیل دینا ہو گی) جو پرانے سماج کا صفایا اور نیا سماج تخلیق کرنے کے قابل ہو۔

صرف مارکس کی فلسفیانہ مادیت نے ہی پرولتاریہ کو اس روحانی غلامی سے نجات کا راستہ دکھایا جس میں تمام محکوم طبقات آج تک نڈھال رہے ہیں۔ صرف مارکس کے معاشی نظریئے نے

ہی سرمایہ داری کے کُل نظام میں پرولتاریہ کے حقیقی مقام کی وضاحت کی ہے۔

امریکہ سے جاپان اور سویڈن سے جنوبی افریقہ تک پرولتاریہ کی آزاد تنظیمیں ساری دنیا میں تیزی سے پھیل رہی ہیں۔ پرولتاریہ طبقاتی جدوجہد کا علم بلند کر کے باشعور اور تربیت یافتہ ہو رہا ہے۔ وہ بورژوا سماج کے تعصّبات کو جھٹک رہا ہے۔ وہ اپنی صفوں کو زیادہ سے زیادہ یکجا کر رہا ہے اور اپنی کامیابیوں کے معیارات کا تعین کرنا سیکھ رہا ہے۔ پرولتاریہ اپنی قوتوں کو فولاد بنا رہا ہے اور ناقابلِ مزاحمت طور پر نشونما پا رہا ہے۔

ولادیمیر لینن

مارچ 1913ء

*****

جدلیاتی مادیت کی ابجد

(The ABC of Materialist Dialectics)

جدلیات نہ تو فکشن ہے، نہ ہی تصوف۔ اگر سوچ روزمرہ زندگی کے مسائل تک محدود نہ ہو بلکہ زیادہ پیچیدہ اور طویل عوامل کو سمجھنے کی کوشش کرے تو جدلیات سوچنے کی سائنس ہے۔ جدلیات اور رسمی منطق میں اسی قسم کا تعلق ہے جو اعلیٰ اور ابتدائی ریاضیات میں ہوتا ہے۔

میں یہاں مسئلے کا لب لباب بہت ٹھوس شکل میں واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔ ارسطو کی سادہ قیاس[ا] کی منطق اس بیان سے شروع ہوتی ہے کہ 'الف' برابر ہے 'الف' کے۔ اس مفروضے کو بے شمار انسانی اعمال اور ابتدائی عمومیت کاریوں کیلئے ایک مسلمہ اصول کے طور پر قبول کرلیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں الف' الف کے برابر نہیں ہوتا۔ اگر ان دونوں حروف کو عدسے کے نیچے رکھ کر دیکھا جائے تو مذکورہ بالا بات آسانی سے ثابت ہو جائے گی۔ وہ ایک دوسرے سے کافی مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ وہ تو فقط ایک جیسی مقدار کی علامات ہیں۔ مثلاً ایک پونڈ چینی۔ لیکن یہ اعتراض بے وزن ہے۔ اصل میں ایک پونڈ چینی' ایک پونڈ چینی کے برابر نہیں ہوتی۔ ایک زیادہ حساس پیمانہ ہمیشہ فرق کو عیاں کر دے گا۔ ایک بار پھر اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ ایک پونڈ چینی اپنے آپ کے برابر ہوتی ہے۔ یہ بھی درست نہیں ہے۔ تمام اجسام کا حجم، وزن اور رنگ وغیرہ مسلسل بدل رہا ہوتا ہے۔ وہ خود اپنے آپ کے بھی برابر نہیں ہوتے۔ لیکن ایک سوفطائی کہے گا کہ ''ایک مخصوص لمحے میں'' ایک پونڈ چینی اپنے آپ کے برابر ہوتی ہے۔

اس ''مسلمہ اصول'' کی انتہائی مشکوک عملی اہمیت سے قطع نظر، یہ نظریاتی تنقید کے سامنے بھی ٹِک نہیں سکتا۔ ہم لفظ ''لمحہ'' کا تصور کیسے کر سکتے ہیں؟ اگر یہ وقت کا ایک نہایت ہی چھوٹا وقفہ ہے تو اس ''لمحے'' کے دوران بھی ایک پونڈ چینی میں ناگزیر تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ یا پھر ''لمحہ'' کوئی خالص ریاضیاتی تجرید، یعنی وقت کا صفر ہے؟ لیکن ہر شے وقت کے اندر موجود ہے اور وجود

بذات خود مسلسل تبدیلی کا عمل ہے۔ نتیجتاً وقت وجود کا بنیادی عنصر ہے۔ لہٰذا 'الف' برابر 'الف' کا مطلب ہے کہ ایک چیز اپنے آپ کے ہی برابر ہوتی ہے بشرطیکہ وہ تبدیل نہ ہو، یعنی کہ وہ موجود ہی نہ ہو۔

پہلی نظر میں یہ ''باریکیاں'' بیکار لگتی ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ فیصلہ کن اہمیت کی حامل ہیں۔ 'الف' برابر 'الف' کا اصول ایک طرف ہمارے تمام علم کا نقطہ آغاز معلوم ہوتا ہے تو دوسری طرف ہمارے علم میں موجود تمام غلطیوں کا نقطہ آغاز بھی لگتا ہے۔ 'الف' برابر 'الف' کے اصول کو کچھ مخصوص حدود میں رہ کر ہی بلا خوف و خطر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جب 'الف' میں آنے والی مقداری تبدیلیاں متعلقہ کام کے لئے برائے نام ہوں تو ہم فرض کر سکتے ہیں کہ 'الف' برابر 'الف' کے ہے۔ مثلاً دکاندار اور خریدار ایک پونڈ چینی کو اِسی طرح سے تولتے ہیں۔ اسی طرح سورج کے درجہ حرارت کو جانچا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک ڈالر کی قوت خرید کا تعین بھی یونہی ہوتا تھا۔ لیکن بعض حدود سے آگے مقداری تبدیلیاں' معیاری تبدیلیوں میں بدل جاتی ہیں۔ ایک پونڈ چینی پانی یا مٹی کے تیل سے مل کر ایک پونڈ چینی نہیں رہتی۔ جب ایک ڈالر صدر کی جیب میں ہوتا ہے تو وہ ایک ڈالر نہیں رہتا۔ سماجیات سمیت تمام علوم کا سب سے اہم اور مشکل فریضہ درست وقت پر اُس فیصلہ کن مرحلے کا تعین کرنا ہوتا ہے جہاں مقدار' معیار میں بدل جاتی ہے۔

ہر مزدور جانتا ہے کہ دو بالکل برابر چیزیں بنانا ناممکن ہے۔ پیتل کو 'کون بیئرنگ' میں ڈھالتے وقت کچھ اونچ نیچ کی اجازت ہوتی ہے، جو مخصوص حدود سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے (اسے 'چھوٹ' کہتے ہیں)۔ اس چھوٹ کی حدود کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی تمام کونیں ایک جیسی تصور کی جاتی ہیں (یعنی 'الف' برابر ہے 'الف' کے)۔ جب اِس چھوٹ سے تجاوز کیا جاتا ہے تو مقدار' معیار میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں کون بیئرنگ گھٹیا یا بالکل ہی ناکارہ بن جاتے ہیں۔

ہماری سائنسی سوچ ہمارے عام عمل بشمول تکنیک کا صرف ایک حصہ ہے۔ تصورات میں بھی ''چھوٹ'' کا عنصر کارفرما ہوتا ہے۔ اِس چھوٹ کا تعین 'الف' برابر 'الف' اصول سے برآمد ہونے والی رسمی منطق سے نہیں بلکہ جدلیاتی منطق سے کیا جاتا ہے، جو اِس اصول سے برآمد ہوتی ہے کہ

ہر چیز ہمیشہ بدل رہی ہوتی ہے۔ 'کامن سینس' کی خاصیت ہے کہ یہ جدلیاتی ''چھوٹ'' کی حدود سے بالکل تجاوز کر جاتی ہے۔

عامیانہ سوچ سرمایہ داری، اخلاقیات، آزادی، مزدور ریاست وغیرہ جیسے تصورات کو جامد تجریدوں (Abstractions) کے طور پر لیتی ہے۔ یعنی سرمایہ داری' سرمایہ داری کے برابر ہے۔ اخلاقیات' اخلاقیات کے برابر ہیں وغیرہ۔ جبکہ جدلیاتی سوچ تمام چیزوں اور مظاہر کو مسلسل تبدیلی کے عمل میں دیکھتی ہے اور ساتھ ہی ان تبدیلیوں کے مادی حالات میں اُس فیصلہ کن حد کا تعین بھی کرتی ہے جس سے آگے الف' الف نہیں رہتا۔ ایک مزدور ریاست' مزدور ریاست نہیں رہتی۔

عامیانہ سوچ کی بنیادی خامی یہ ہے کہ یہ خود کو اُس حقیقت کے بے حرکت اور جامد ٹھپوں سے مطمئن کرنا چاہتی جو مشتمل ہی ازلی حرکت پر ہے۔ جبکہ جدلیاتی سوچ قریبی تخمینوں کے ذریعے تصورات کو درستگی، حقیقت، مواد کی کثرت اور لچک عطا کرتی ہے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ''رسیلا پن'' عطا کرتی ہے، جو کسی حد تک انہیں زندہ مظاہر کے قریب لے آتا ہے۔ یعنی بالعموم سرمایہ داری نہیں بلکہ ارتقا کے ایک خاص مرحلے کی سرمایہ داری۔ بالعموم مزدور ریاست نہیں بلکہ سامراجی محاصرے میں محصور ایک پسماندہ ملک کی مخصوص مزدور ریاست۔

جدلیاتی سوچ کا عامیانہ سوچ سے وہی تعلق ہے جو متحرک فلم کا ایک ساکت تصویر سے ہوتا ہے۔ متحرک فلم ساکت تصویر کو ممنوع نہیں بنا دیتی بلکہ ساکت تصویروں کے ایک پورے سلسلے کو حرکت کے قوانین کے تحت یکجا کر دیتی ہے۔ جدلیات' منطقی قیاس سے انکار نہیں کرتی بلکہ بہت سے منطقی قیاسوں کو اس طرح جوڑ دیتی ہے کہ ہم ازل سے تغیر پذیر حقیقت کا ادراک زیادہ قریب سے کر سکتے ہیں۔ ہیگل نے اپنی تصنیف 'لاجک' میں قوانین کا ایک سلسلہ مرتب کیا تھا: مقدار کی معیار میں تبدیلی، تضادات کے ذریعے ارتقا، مافیہ (Content) اور صورت (Form) کا تضاد، تسلسل کا ٹوٹ جانا، امکان کا ناگزیریت میں بدل جانا وغیرہ۔ نظریاتی سوچ کیلئے یہ قوانین اتنے ہی ضروری ہیں جتنا کہ بنیادی کاموں کے لئے منطقی قیاس ہے۔

ہیگل نے ڈارون اور مارکس سے پہلے لکھا تھا۔ انقلابِ فرانس نے سوچ کو جو زبردست

تحریک دی تھی اسکی بدولت ہیگل نے سائنس کی عمومی حرکت کو پیشگی دیکھ لیا تھا۔لیکن ایک بڑے دماغ کی پیش بینی ہونے کے باوجود ہیگل نے اِسے خیال پرستانہ کردار دے دیا تھا۔اس نے نظریاتی پرچھائیوں کو حتمی حقیقت کے طور پر استعمال کیا۔لیکن مارکس نے واضح کیا کہ یہ نظریاتی پرچھائیاں درحقیقت مادی اجسام کی حرکت کی عکاسی کے سوا کچھ نہیں تھیں۔

ہم اپنی جدلیات کو مادی اِس لئے کہتے ہیں کہ اس کی بنیادیں نہ تو آسمانوں میں ہیں نہ ہی ''آزادانہ مرضی'' کی گہرائیوں میں، بلکہ یہ معروضی حقیقت یعنی فطرت میں ہیں۔شعور نے لاشعور سے جنم لیا ہے،نفسیات نے جانداروں کے جسموں کے علم (فزیالوجی) سے، نامیاتی دنیا نے غیر نامیاتی دنیا سے، نظامِ شمسی نے گرد اور گیسوں کے بادلوں سے۔ارتقا کی اِس سیڑھی کے ہر زینے پر مقداری تبدیلیاں' معیاری تبدیلیوں کو جنم دیتی رہی ہیں۔ ہماری سوچ درحقیقت مسلسل تغیر پذیر مادے کے اظہار کی محض ایک شکل ہے۔اِس نظام میں لافانی روح اور قوانین واخلاقیات کے ازلی وابدلی اصولوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔فطرت کی جدلیات میں سے ہی سوچ کی جدلیات برآمد ہوئی ہے اور نتیجتاً اس کا کردار مکمل طور پر مادی ہے۔

ڈارونزم، جو مقداری سے معیاری تبدیلیوں کے ذریعے انواع کے ارتقا کی وضاحت کرتا ہے، نامیاتی مادے کے میدان میں جدلیات کی سب سے بڑی فتح تھی۔عناصر کے ایٹمی وزن کے جدول اور مزید برآں ایک عنصر کی دوسرے میں تبدیلی کی دریافت ایک اور عظیم فتح تھی۔

عناصر اور انواع (Species) وغیرہ میں آنے والی اِن تبدیلیوں کیساتھ درجہ بندی کا سوال بھی جڑا ہوا ہے، جو فطری اور سماجی سائنس میں برابر اہمیت کا حامل ہے۔اٹھارویں صدی میں (سویڈن کے ماہر نباتات) لنیئیس کا مرتب کردہ نظام، جس کا نقطہ آغاز انواع کی عدم تبدیلی تھا،صرف بیرونی خاصیتوں کی بنیاد پر پودوں کی وضاحت اور درجہ بندی تک محدود تھا۔علم نباتات کا بچپن بھی منطق کے بچپن جیسا ہی ہے، کیونکہ ہماری سوچ کی شکلیں بھی ہر زندہ چیز کی طرح نشونما پاتی ہیں۔انواع کی عدم تبدیلی کے خیال کو فیصلہ کن طور پر رد کرتے ہوئے، پودوں اور اُن کی اناٹومی کے ارتقا کی تاریخ کا مطالعہ ہی حقیقی سائنسی درجہ بندی کی بنیاد بنا ہے۔

مارکس، جو ڈارون کے برعکس ایک شعوری ماہر جدلیات تھا، نے دریافت کیا کہ پیداواری

قوتوں کی ترقی اور سماج کی ساخت مرتب کرنے والے ملکیت کے رشتوں کے ڈھانچے کو انسانی سماجوں کی درجہ بندی کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔ سماجوں اور ریاستوں کی عامیانہ تشریحی درجہ بندی، جو آج تک بھی یونیورسٹیوں میں پنپ رہی ہے، کی جگہ مارکسزم نے مادی جدلیاتی درجہ بندی کو دی۔ مارکس کا طریقہ کار استعمال کر کے ہی مزدور ریاست کے تصور اور اس کے زوال کے وقت کا تعین درست طور پر کیا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اِس سب میں کچھ بھی ''مابعدالطبیعیاتی'' یا ''کتابی'' نہیں ہے، جیسا کہ خود پسندی اور ڈھٹائی پر مبنی جہالت کا دعویٰ ہے۔ جدلیاتی منطق آج کی سائنسی سوچ میں حرکت کے قوانین کا اظہار کرتی ہے۔ اس کے برعکس جدلیاتی مادیت کے خلاف مزاحمت ایک دور افتادہ ماضی، پیٹی بورژوازی کی قدامت پرستی، یونیورسٹیوں میں لگے بندھے معمول پر چلنے والوں کی خود فریبی اور... آخرت کی زندگی کی سلگتی امید کا اظہار کرتی ہے۔

لیون ٹراٹسکی

دسمبر 1939ء

*****

[ا] قیاس یا 'Syllogism' یعنی ایک مخصوص قسم کا منطقی استدلال، جس میں تین قضیے ہوتے ہیں جن میں سے پہلے دو مقدمات کہلاتے ہیں (کبریٰ اور صغریٰ)، تیسرے کو نتیجہ کہتے ہیں جو پہلے دو کا ناگزیر حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً (۱) درخت چل پھر نہیں سکتا۔ (۲) پیپل ایک درخت ہے۔ (۳) لہٰذا پیپل چل پھر نہیں سکتا۔

کیاسوویت یونین کاانہدام سوشلزم کی ناکامی نہیں؟

بعض اوقات دہائیاں بیت جاتی ہیں اور کچھ نہیں ہوتا۔لیکن پھر چند دنوں میں دہائیوں سے بڑے واقعات رونما ہوجاتے ہیں۔ 27 سال قبل سوویت یونین کے انہدام کے بعد ایک نہ رکنے والی تکرار تھی۔کہاجارہاتھاکہ سوشلزم ناکام ہوگیاہے،سیاست اور معیشت کے بڑے معرکوں کا حتمی فیصلہ ہوگیاہےاورآزادمنڈی کی معیشت حتمی طور پر فتح یاب ہوچکی ہے۔سرمایہ داری کے منصوبہ ساز فتح کی خوشی میں بدمست تھے۔امریکی سامراج کے دانشور فرانسس فوکویاما کے پیش کردہ ''تاریخ کے خاتمے'' کے نظریئے اور جارج بش سینئر کے مجوزہ ''نیو ورلڈ آرڈر'' کا مقصد ایک ایسی دنیا کا قیام تھا جس میں بغیر کسی حریف کے ایک ہی طاقت اور ایک ہی نظام غالب ہو۔

سوویت یونین کے ٹوٹنے اور اس سے پیشتر چین میں سرمایہ داری کی دوبارہ استواری جیسے ردِانقلابی واقعات ایک عہد کے اختتام اور ایک نئے رجعتی عہد کے آغاز کی نشاندہی کرتے تھے۔ اِس سلسلے میں 1980ء کی دہائی کے دومزید واقعات اہم ہیں: 1984ء میں امریکہ میں ائیر ٹریفک کنٹرولرز کی ہڑتال کی ناکامی اور اسی دوران برطانیہ میں کانکنی کے محنت کشوں کی عظیم ہڑتال پر مارگریٹ تھیچر حکومت کی جارحیت،جس سے بعدازاں برطانیہ میں پوری کانکنی کی صنعت ہی برباد ہوگئی۔ان پے درپے ردِانقلابی واقعات اور پوری دنیا میں نیولبرل سرمایہ داری کی یلغار کے ماحول میں فوکویاما کے 'تاریخ کے خاتمے' کے نظریئے کے آگے بائیں بازو کے بڑے بڑے دانشوروں اور نظریہ دان بھی ہتھیار ڈالتے چلے گئے۔بہت سے ماسکواور پیکنگ نواز'کمیونسٹوں' نے اپنے قبلے ڈھیر ہوتے دیکھ کر سرمایہ داری کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔'تاریخ کے اختتام' کا عملی طور پر مطلب یہ تھا کہ سوشلزم اور مارکسزم ناکام ہوچکے ہیں اوراب سرمایہ داری ہی نسل انسان کا حتمی مقدر ہے۔

بالشویک پارٹی کی قیادت میں اکتوبر 1917ء کے انقلاب روس نے تاریخ کا رخ موڑ

دیا تھا۔ انقلابی واقعات میں شریک اور عینی شاہد امریکی صحافی اور انقلابی جان ریڈ اپنی شہرہ آفاق کتاب 'دنیا کو جھنجوڑ دینے والے دس دن' میں لکھتا ہے، ''بالشویزم کے بارے میں کوئی کچھ بھی کہتا رہے، اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ انقلابِ روس انسانی تاریخ کے اہم ترین واقعات میں سے ایک ہے اور بالشویزم ایک عالمی اہمیت کا حامل مظہر ہے۔'' قدیم روسی کیلنڈر کے مطابق روس میں انقلابی سرکشی اور بالشویکوں کا اقتدار پر قبضہ 26 اکتوبر کی شب ہوا۔ جدید کیلنڈر کے مطابق یہ تاریخ 7 نومبر بنتی ہے۔

انقلاب کی فتح نے چھوٹے سے استحصالی طبقے سے اقتدار چھین کر اسے سماج میں موجود محنت کش طبقات کی وسیع اکثریت کے ہاتھوں میں دے دیا۔ بورژوا ریاست کا تختہ الٹنے اور اقتدار پر پرولتاریہ کے قبضے کے عمل میں محنت کشوں کی وسیع اکثریت کی شعوری مداخلت اور شمولیت موجود تھی۔ انقلاب کے قائد ولادیمیر لینن نے اس انقلاب کے مطمع نظر حقیقی تبدیلی کی وضاحت کی۔ دسمبر 1917ء میں اس نے لکھا ''ہر قیمت پر ہمیں اس قدیم، بیہودہ، وحشی، گھٹیا، اور امتیاز پر مبنی عقیدے کا خاتمہ کرنا ہے کہ صرف نام نہاد بالائی طبقہ، صرف اشرافیہ کے سکولوں میں پڑھنے والے لوگ ہی ریاست کا انتظام چلانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔''

لینن کے ہمراہ انقلابِ روس کا کلیدی رہنما لیون ٹراٹسکی اپنی شہرہ آفاق تصنیف 'انقلابِ روس کی تاریخ' میں بالشویکوں کے متعلق لکھتا ہے، ''بالشویزم نے ایک ایسا مستند انقلابی فرد تخلیق کیا جو اپنے ذاتی وجود، خیالات اور اخلاقی فیصلوں کو ایسے تاریخی مقاصد کے تابع کرتا ہے جو مروجہ سماج سے ناقابل مصالحت ہوتے ہیں۔ پارٹی میں بورژوا نظریات سے ضروری فاصلہ ایک چوکس عدم مصالحت کے ذریعے برقرار رکھا گیا تھا، جس کا روح رواں لینن تھا۔ لینن ایک نشتر کی طرح اُن تمام بندھنوں کو مسلسل کاٹتا رہتا تھا جو پیٹی بورژوا ماحول میں پارٹی اور سرکاری رائے عامہ کے درمیان استوار ہوتے تھے۔ عین اسی وقت لینن نے پارٹی کو ابھرتے ہوئے طبقے کے خیالات اور جذبات کی بنیاد پر اپنی رائے عامہ استوار کرنا بھی سکھایا۔ یوں انتخاب، تربیت اور مسلسل جدوجہد کے عمل سے بالشویک پارٹی نے نہ صرف اپنا سیاسی بلکہ اخلاقی ماحول بھی تخلیق کیا، جو بورژوا رائے عامہ سے آزاد اور بالکل برخلاف تھا۔ صرف اِسی چیز نے بالشویکوں کو اپنی صفوں میں تذبذب پر قابو

پانے اور عمل میں وہ عزم دکھانے کے قابل بنایا جس کے بغیر اکتوبر کی فتح ناممکن تھی۔‘‘

فتح مند سرکشی کے بعد لینن نے ’سوویتوں کی کُل روس کانگریس‘ سے خطاب کرتے ہوئے کہا، ’’تاریخ کے کچرے کو صاف کرنے کے بعد اب ہم اس خالی جگہ پر سوشلسٹ سماج کی ہوادار اور عالیشان عمارت تعمیر کریں گے۔‘‘ انقلاب سے سماجی و معاشی تبدیلی کے ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔ جاگیریں، صنعتیں، بینک، کارپوریٹ اجارہ داریاں اور معیشت کے کلیدی حصوں کو نوزائیدہ مزدور ریاست نے ضبط کر لیا۔ تمام بیرونی تجارت اور لین دین پر ریاست کی اجارہ داری قائم کر دی گئی۔ ریاستی اہلکاروں کی مراعات اور عیاشیوں کا خاتمہ کر دیا گیا اور انقلاب کے رہنماؤں کے حالاتِ زندگی انتہائی عاجزانہ تھے۔ اپنی کتاب ’ایک انقلابی کی یادداشتیں‘ میں وکٹر سرج لکھتا ہے، ’’کریملن میں لینن نوکروں کے لئے تعمیر کئے گئے چھوٹے سے گھر میں رہتا تھا۔ موسم سرما کے دوران باقی سب کی طرح اُس کے پاس بھی گھر کو گرم رکھنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ جب وہ نائی کے پاس جاتا تو اپنی باری کا انتظار کرتا اور کسی دوسرے کے پیچھے ہٹنے کو نامناسب خیال کرتا۔‘‘

1917ء کی انقلابی حکومت بالشویکوں، بائیں بازو کے سوشل انقلابیوں اور منشویک انٹرنیشنلسٹوں کے اتحاد پر مبنی تھی۔ صرف فاشسٹ گروہ ’بلیک ہنڈرڈز‘ پر پابندی لگائی گئی۔ حتیٰ کہ بورژوا لبرل (کیڈٹ) پارٹی پر بھی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ یہ انسانی تاریخ کی سب سے جمہوری حاکمیت تھی جو ہر سطح پر محنت کشوں کی کونسلوں (سوویتوں) پر مبنی جمہوریت کے ذریعے معیشت، ریاست اور سماج کا تمام تر نظام چلاتی تھی۔ اِس سوویت نظامِ حکومت کے بنیادی اصول درج ذیل تھے:

- سوویت ریاست کے تمام عہدوں کے لیے آزادانہ جمہوری انتخابات
- منتخب اہلکاروں کو کسی بھی وقت واپس بلائے جانے کا حق
- کسی ریاستی اہلکار کی اجرت کا ہنرمند مزدور کی اجرت سے زیادہ نہ ہونا
- تمام ذمہ داریاں بتدریج اور باری باری سب کو دینا

یہ انقلاب محکوم اور استحصال زدہ محنت کش طبقات کے لئے کیا معانی رکھتا تھا، اس کی تصویر کشی بڑے پرتاثیر انداز سے جان ریڈ نے کی ہے: ’’کسی بنجر زمین پر موتیوں کی طرح سارے افق پر دارالحکومت (پیٹروگراڈ) کی روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں، جو رات کے وقت دن سے کہیں زیادہ

شاندار لگ رہی تھیں۔ بوڑھا خاکروب، جو ایک ہاتھ سے ریڑھی چلا رہا تھا اور دوسرے سے راہ گزر پر جھاڑو دے رہا تھا، دور سے دمکتے دارالحکومت کو دیکھ کر بے ساختہ چلّا اٹھا، ’میرا! سارا پیٹروگراڈ اب میرا ہے!‘‘‘

یوں بالشویک انقلاب سماجی، ثقافتی اور نفسیاتی طور پر محنت کش طبقے کو بے نظیر بلندیوں پر لے گیا تھا۔

اگر انقلابی فتح کی وضاحت سائنسی تجزیئے سے کی جاسکتی ہے تو مارکسسٹوں پر یہ تاریخی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ بعدازاں انقلاب کی زوال پذیری اور سوویت یونین کے انہدام کی سائنسی وضاحت کریں۔ درحقیقت لینن نے ایک ملک میں سوشلزم کی تعمیر کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ بین الاقوامیت لینن کے لئے کوئی جذباتی لفاظی نہیں تھی۔ وہ انقلاب کو معاشی و تکنیکی طور پر زیادہ ترقی یافتہ ممالک تک پھیلانے کی ناگزیر ضرورت سے بخوبی واقف تھا۔

7 مارچ 1918ء کو لینن نے صورت حال کا جائزہ لیا: ’’اگر ہم تنہا رہ گئے اور دوسرے ممالک میں انقلابی تحریکیں نہ ابھریں تو عالمی تاریخی نقطۂ نظر سے ہمارے انقلاب کی حتمی فتح کی کوئی امید باقی نہیں رہے گی... میں پھر دہراتا ہوں کہ ان تمام مشکلات سے ہماری نجات کا ذریعہ ایک کُل یورپی انقلاب ہے۔‘‘ (مجموعہ تصانیف جلد 27 صفحہ 95)

وہ آخر میں کہتا ہے کہ ’’اگر جرمن انقلاب وقوع پذیر نہ ہوا تو ہر حال میں ہماری تباہی یقینی ہے۔‘‘ (ایضاً۔ صفحہ 98)

کئی ہفتوں بعد لینن نے اسی موقف کو دہرایا: ’’ہماری پسماندگی نے ہمیں اگلی صف میں لا کھڑا کیا ہے اور اگر ہم اس وقت تک نہ ڈٹے رہے جب تک دوسرے ملکوں میں انقلاب برپا کرنے والے محنت کشوں کی زبردست مدد نہیں ملتی تو ختم ہو جائیں گے۔‘‘ (ایضاً۔ صفحہ 232)

لینن نے بالشویک انقلاب کے مقدر کو ترقی یافتہ یورپ، بالخصوص جرمنی کے انقلاب سے ایک مرتبہ نہیں بلکہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں بار بار جوڑا۔ دسمبر 1919ء میں اُس نے واضح کیا: ’’اکتوبر سے پہلے اور اکتوبر کے بعد بھی ہم نے ہمیشہ کہا ہے کہ ہم خود کو صرف اور صرف عالمی پرولتاری فوج کے جتھوں میں سے ایک جتھہ سمجھتے ہیں۔ ہم نے ہمیشہ کہا ہے کہ سوشلسٹ انقلاب

کی فتح کو صرف اسی وقت یقینی سمجھا جا سکتا ہے جب یہ کم از کم کئی ترقی یافتہ ممالک کے پرولتاریہ کی فتح بن جائے۔'' (مجموعہ تصانیف جلد 30 صفحہ 207)

فروری 1922ء میں اُس نے ایک بار پھر کہا: ''لیکن ہم نے اپنی سوشلسٹ معیشت کی بنیاد رکھنے کا کام ابھی مکمل نہیں کیا اور قریب المرگ سرمایہ داری کی جارح قوتیں ہمیں اب بھی اس سے محروم کر سکتی ہیں۔ ہمیں واضح طور پر اسے سمجھنا اور تسلیم کرنا چاہیے کیونکہ جھوٹے خوابوں سے زیادہ خطرناک کوئی چیز نہیں ہوتی... اور اس کڑوی حقیقت کو تسلیم کرنا کوئی بہت خوفناک بات نہیں کیونکہ ہم نے ہمیشہ مارکسزم کی اس بنیادی سچائی کو دہرایا اور اس پر زور دیا ہے کہ سوشلزم کی فتح کیلئے کئی ترقی یافتہ ممالک کے محنت کشوں کی مشترکہ کوششوں کی ضرورت ہوگی۔'' (مجموعہ تصانیف جلد 33 صفحہ 206)

درحقیقت 1917ء کا انقلابِ روس کوئی الگ تھلگ قومی واقعہ نہیں تھا بلکہ اس کے دوررس بین الاقوامی اثرات مرتب ہوئے۔ اس نے روس میں نہ صرف سرمایہ داری اور جاگیرداری کو اکھاڑا بلکہ سامراج کی بیڑیاں بھی توڑ ڈالیں۔ یہ سوویت یونین کی سرحدوں سے بہت دور (بالخصوص یورپ میں) انقلابی ابھاروں کا محرک بنا۔ سامراجی آقا اِن عوامی بغاوتوں سے لرز گئے جو سرمایہ داروں کے قلعوں میں ابھرنے لگی تھیں۔ برطانوی وزیراعظم لائڈ جارج نے اپنے فرانسیسی ہم منصب کلیمنسو کو 1919ء کے ورسائی کے امن اجلاس کے دوران ایک خفیہ مراسلے میں لکھا: ''پورا یورپ انقلابی جذبات سے لبریز ہے۔ موجودہ حالات کے خلاف محنت کشوں میں نہ صرف عدم اطمینان بلکہ غصے اور بغاوت کا گہرا احساس موجود ہے۔ یورپ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سارے سیاسی، سماجی اور معاشی نظام پر عوام سوال اٹھا رہے ہیں۔''

انقلاب کے مرکز کو کچلنے کے لئے اِن سرمایہ دارانہ 'جمہوریتوں' نے نومولود سوویت ریاست پر دیوہیکل حملہ کیا۔ اکیس سامراجی ممالک کی افواج روس پر چڑھ دوڑیں۔ خود انقلاب نسبتاً پرامن معاملہ تھا۔ اکتوبر کی سرکشی کے دوران صرف نو لوگ ہلاک ہوئے تھے۔ لیکن یہ سامراجی عسکری جارحیت تھی جس نے پہلے سے عالمی جنگ سے تباہ حال اور پسماندہ ملک کو مزید خونریزی اور قحط میں غرق کر دیا۔ بالواسطہ یا براہِ راست طور پر اِس خانہ جنگی کے نتیجے میں ہلاک ہونے والوں کی

تعداد کا تخمینہ 80 لاکھ تک جاتا ہے۔عوام کی انتہائی محرومی اور بدحالی، جسے خانہ جنگی اور معاشی ناکہ بندی نے شدید تر کر دیا، کی وجہ سے 'ذاتی بقا کی جدوجہد' ختم یا کم نہیں ہوئی بلکہ وحشی کردار اختیار کر گئی۔ یوں انتہائی ترقی یافتہ سرمایہ داری کی بنیاد پر سوشلزم کی تعمیر کی بجائے سوویت ریاست نہ صرف قبل از سوشلزم بلکہ قبل از سرمایہ داری کے مسائل پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ سرمایہ داری سے آگے کا سفر تو دور کی بات اب انقلاب کو بچانا ایک کٹھن فریضہ بن چکا تھا۔ یہ صورتحال مارکس کی 'کمیونزم کے پہلے درجے' والی سوچ سے بہت مختلف تھی۔ انہی حالات میں افسر شاہی کے ظہور کو لیون ٹراٹسکی ایک عام مثال سے سمجھاتا ہے: جب کسی بھی چیز کی قلت پیدا ہوتی ہے تو اس کے حصول کے لیے قطاریں لگ جاتی ہیں۔ جتنی زیادہ بدحالی ہوگی ان قطاروں میں اتنا ہی خلفشار ہوگا۔ ان کو کنٹرول کرنے کے لئے ایک سپاہی کی ضرورت جنم لیتی ہے۔ اگر گوشت کے حصول کیلئے ایسی قطاریں لگتی ہیں تو ان کو کنٹرول کرنے والا سپاہی اپنے لئے اچھا گوشت پہلے کٹوا کر رکھ لے گا۔ یہی عمل افسر شاہی کے جنم کی بنیاد بنتا ہے۔

سرخ فوج کی دلیرانہ مزاحمت اور حملہ آور ریاستوں کے مزدوروں اور سپاہیوں کی حمایت نے سامراجی جارحیت کو شکست دی۔ ٹراٹسکی نے زار کی بچی کھچی چند لاکھ کی تباہ حال فوج کو پچاس لاکھ کی مضبوط اور منظم سرخ فوج میں تبدیل کر دیا۔ لیکن بالشویک پارٹی کے ہراول کارکنان اور باشعور محنت کش اِس خانہ جنگی میں بڑی تعداد میں مارے گئے۔ اِس سے قیادت کا خلا پیدا ہوا جسے پارٹی اور سوویت حکومت میں گھسنے والے موقع پرستوں نے بھرا۔ ضروریات زندگی کی شدید قلت، صنعت و زراعت کے انہدام اور ثقافتی و تکنیکی پسماندگی نے انقلاب کی افسر شاہانہ زوال پذیری میں کلیدی کردار ادا کیا۔ جوزف سٹالن اِس زوال پذیری کا شخصی اظہار اور نئی ابھرنے والی افسر شاہی کا نمائندہ تھا۔ اُس نے بیوروکریٹوں کی پرت پر انحصار کرتے ہوئے اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کی اور بدلے میں ان کی مراعات کا تحفظ یقینی بنایا۔ جرمنی (1918ء اور پھر 1923ء)، چین (1924-25ء) اور برطانیہ (1926ء) میں انقلابات کی شکستوں نے انقلابِ روس کی تنہائی اور زوال پذیری کو شدید تر کر دیا۔ لینن 1924ء میں اپنی موت تک اِس کے خلاف جدوجہد کرتا رہا۔ سٹالن نے اُس کی وصیت کو کریملن کی آہنی الماریوں میں چھپا دیا۔ اِس وصیت

میں لینن نے سٹالن کو پارٹی کے سیکرٹری جنرل کے عہدے سے ہٹانے اور افسر شاہی کے خلاف جدوجہد کی کال دی تھی۔ یہ دستاویز سٹالن کی موت کے بعد 1956ء میں پارٹی کی بیسویں کانگریس میں کہیں جا کر سامنے آئی۔ ایک پسماندہ ملک میں انقلاب کا مقید ہو جانا حالات کا جبر تھا۔ لیکن لینن کی وفات کے بعد سٹالن نے اسے ایک نظریاتی شکل دے دی اور ''ایک ملک میں سوشلزم'' کا نعرہ لگایا، جو نہ صرف مارکسزم کے بنیادی نظریات سے متصادم تھا بلکہ چند سال پہلے تک بالشویک پارٹی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اِن حالات میں ٹراٹسکی نے 'لیفٹ اپوزیشن' قائم کی اور 'سٹالنزم' کے خلاف مردانہ وار مزاحمت کی۔ لیکن حالات و واقعات اُس کے حق میں نہیں تھے۔ لیفٹ اپوزیشن کو انتہائی جبر سے کچل دیا گیا اور لاکھوں کی تعداد میں پرانے بالشویکوں کو قتل کر دیا گیا یا سائبیریا کے یخ بستہ میدانوں میں سردی اور مشقت سے سسک سسک کر مرنے کے لئے جلاوطن کر دیا گیا۔ یہ عمل وسیع مراعات رکھنے والے افسر شاہانہ ڈھانچے کے استحکام پر منتج ہوا۔ اجرتوں میں زیادہ سے زیادہ فرق، جو لینن کے دور میں 4:1 طے کیا گیا تھا، ختم کر دیا گیا۔ اکتوبر انقلاب کے خلاف یہ سیاسی ردِ انقلاب اتنا جابر تھا کہ 1940ء تک 1917ء میں انقلاب کی قیادت کرنے والی بالشویک مرکزی کمیٹی میں سے صرف ایک انسان باقی بچا تھا۔ یہ سٹالن خود تھا۔ باقی تمام قیادت کو جعلی مقدمات اور شو ٹرائلز کے بعد سزائے موت دے دی گئی، قتل یا 'غائب' کروا دیا گیا یا پھر انہوں نے خودکشی کر لی۔ بہت کم تھے جو طبعی موت مرے۔

تاہم سٹالنسٹ زوال پذیری کے باوجود معیشت ریاست کی ملکیت اور منصوبہ بندی میں رہی۔ سٹالنسٹ افسر شاہی کوئی طبقہ نہیں تھی، کیونکہ یہ ذرائع پیداوار کی مالک نہیں تھی، بلکہ یہ ایک طفیلی پرت تھی جو سوویت محنت کش طبقے کی پیدا کردہ دولت کا ایک بڑا حصہ ہڑپ کر جاتی تھی۔ تاہم معیشت پر اِس بھاری بوجھ اور افسر شاہانہ بدانتظامی کے باوجود سوویت منصوبہ بند معیشت نے انسانی تاریخ کی تیز ترین ترقی کی۔ چند دہائیوں میں سوویت یونین ایک پسماندہ زرعی ملک سے ترقی یافتہ صنعتی ملک بن گیا۔ سرمایہ داری کی پوری تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔

ٹیڈ گرانٹ نے اپنی پرمغز کتاب 'روس، انقلاب سے ردِ انقلاب تک' میں لکھا: ''1913ء

(قبل از جنگ پیداوار کا عروج) کے بعد کے پچاس سالوں میں دو عالمی جنگوں، بیرونی جارحیت، خانہ جنگی اور دوسری بربادیوں کے باوجود کُل صنعتی پیداوار میں 52 گنا اضافہ ہوا۔ اِس دوران امریکہ میں یہ اضافہ چھ گنا جبکہ برطانیہ میں دوگنا سے بھی کم تھا۔ دوسرے الفاظ میں سوویت یونین ایک پسماندہ زرعی ملک سے دنیا کی دوسری سب سے طاقتور قوم بن گیا، جس کے پاس ایک دیوہیکل صنعتی بنیاد، اعلیٰ ثقافتی معیار اور امریکہ، یورپ اور جاپان میں سائنسدانوں کی کُل تعداد سے زیادہ سائنسدان تھے۔ اوسط عمر میں دوگنا سے زیادہ اضافہ ہوا اور بچوں میں شرح اموات میں نو گنا کمی واقع ہوئی۔ اتنی مختصر مدت میں اتنی تیز معاشی پیش رفت کی دوسری کوئی مثال نہیں ملتی۔''

یہ سب ایک ایسی معیشت کی بدولت تھا جس کی قوت محرکہ منافع خوری نہیں بلکہ انسانی ضروریات کی تکمیل تھی۔ 1990ء تک سوویت یونین اسٹیل، مشین ٹولز، ٹریکٹر، ٹرکوں، سیمنٹ، کوئلہ، گیس، تیل، ریلوے، بجلی سمیت 30 اہم اور بنیادی صنعتوں میں دنیا میں سب سے زیادہ پیداوار کر رہا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد 25 سالوں میں مغربی ممالک کی نسبت سوویت یونین نے 1975ء تک دوگنا ترقی کی۔ اس دوران سماجی خرچ کی مد میں 400 فیصد سے زیادہ اضافہ ہوا۔ بنیادی اور ثانوی تعلیم پوری آبادی پر لازم تھی۔ شرح خواندگی 99 فیصد تک پہنچ گئی۔ دنیا میں سب سے زیادہ ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان اور ماہرین سوویت یونین میں تھے۔ مکانوں اور ذرائع آمدورفت کے کرائے دنیا میں سب سے کم تھے۔ کئی شعبوں مثلاً خلائی تکنیک میں سوویت یونین نے امریکہ کو پچھاڑ دیا تھا۔ اسی طرح 1960ء کی دہائی کے اواخر میں اوسط عمر بھی امریکہ سے تجاوز کر گئی۔

انقلاب نے جنسی برابری اور زندگی کے ہر شعبے میں خواتین کی شمولیت کو یقینی بنایا۔ حکومت سکولوں میں مفت کھانا، بچوں کے لئے دودھ، حاملہ خواتین اور زچہ بچہ کے لئے طبی مراکز، دارالاطفال اور پرورش خانے مہیا کرتی تھی۔ تعلیم و علاج سمیت یہ تمام سہولیات بالکل مفت تھیں۔ رہائش کا مسئلہ حل کرنے کے لئے پانچ کروڑ سے زیادہ فلیٹ تعمیر کئے گئے۔ ریاست روزگار کی ضامن تھی اور بیروزگاری ایک جرم تصور ہوتی تھی۔ یوں منصوبہ بند معیشت نے منڈی کی معیشت پر اپنی فوقیت جدلیات کی زبان میں نہیں بلکہ ٹھوس مادی اور ثقافتی ترقی میں ثابت کی۔ 1928ء

کے بعد بالعموم اور دوسری عالمی جنگ کے بعد بالخصوص سوویت یونین میں منصوبہ بند معیشت جس رفتار سے ترقی کر رہی تھی اس کے پیش نظر امریکی سامراج کے سنجیدہ پالیسی سازوں کا خیال تھا کہ صدی کے اواخر تک سوویت یونین امریکہ کو پچھاڑ کر دنیا کی سب سے بڑی معیشت بن جائے گا۔ بہرحال افسر شاہانہ بدانتظامیوں کی وجہ سے 1970ء میں سوویت معیشت جمود کا شکار ہونے لگی۔

آج تمام تر سامراجی پراپیگنڈے میں ان حقائق سے لوگوں کو بری طرح بے خبر رکھا جاتا ہے۔ لیکن دوسری جانب جو لوگ اس ترقی کے صرف ایک رخ سے متاثر ہو کر روسی اور چینی افسر شاہی کے پیروکار بن گئے، وہ اتنی دیوہیکل ترقی کے باوجود سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ کے اسباب بیان کرنے سے قاصر ہیں۔

درحقیقت سوویت معیشت جوں جوں پھیلتی گئی، زیادہ پیچیدہ، ثقیف اور ترقی یافتہ ہوتی گئی۔ چند ہزار اشیا پیدا کرنے والی معیشت کی منصوبہ بندی چند سو افسران کر سکتے ہیں۔ لیکن دس لاکھ اشیا بنانے والی معیشت کو افسر شاہانہ طریقوں سے نہیں چلایا جا سکتا۔ ٹراٹسکی نے واضح کیا تھا کہ ایک منصوبہ بند معیشت کے لئے مزدور جمہوریت اتنی ہی ضروری ہے جتنی انسانی جسم کے لئے آکسیجن۔ 1960ء تک سوویت معیشت ایک دیوہیکل حجم حاصل کر چکی تھی اور یہ امریکہ کے بعد دنیا کی دوسری بڑی معیشت تھی جو کپڑوں اور جوتوں سے لے کر ہوائی جہاز اور خلائی راکٹ تک پیدا کرتی تھی۔ افسر شاہی کی بدانتظامی، بدعنوانی، عیاشیوں اور ضیاں کے بوجھ تلے اِس معیشت کا دم گھٹ رہا تھا۔ نتیجتاً معاشی نمو کی شرح ایک وقت پر صفر ہو گئی۔ دوسری طرف سوویت افسر شاہی کی ہوس اس قدر بڑھ چکی تھی کہ وہ اب اپنی مراعات کو اپنے بچوں تک منتقل کرنا چاہتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں وہ ذرائع پیداوار کو اپنی نجی ملکیت میں لے کر ایک مراعت یافتہ سماجی پرت سے ایک حکمران طبقے میں تبدیل ہونا چاہتے تھے۔

لیون ٹراٹسکی نے 1936ء میں شائع ہونے والی اپنی عمیق تصنیف 'انقلاب سے غداری' میں انقلاب کی زوال پذیری کا تجزیہ پیش کیا تھا: ''سوویت بیوروکریسی کبھی بھی پرامن اور رضاکارانہ طور پر سوشلسٹ مساوات کے حق میں اپنی مراعات ترک نہیں کرے گی۔ یہ مراعات تب تک ادھوری ہیں جب تک ایک بیوروکریٹ انہیں اپنے بچوں تک منتقل نہ کر سکے... لہٰذا ایک

ریاستی ادارے کا ڈائریکٹر ہونا ہی کافی نہیں بلکہ اس میں حصہ داری ضروری ہے۔اس صورت میں افسر شاہی ایک نئے صاحب ملکیت طبقے میں تبدیل ہو جائے گی۔'' یوں 1980ء کی دہائی میں ہونے والے دیوہیکل واقعات کی مشروط پیش گوئی ٹراٹسکی نے پانچ دہائیاں قبل کی تھی۔اس نے واضح کیا تھا کہ اگر ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک میں انقلاب نہیں ہوتا اور سوویت یونین میں ایک سیاسی انقلاب مزدور جمہوریت کو بحال نہیں کرتا تو سرمایہ داری کی بحالی ناگزیر ہے۔دوسری طرف بالشویک انقلاب کے بعد کی سات دہائیوں تک مغربی سامراج کے دانشور کسی بھی بڑی شان و شوکت والی یونیورسٹی کی تحقیق یا پی ایچ ڈی تھیسس میں ایسی کوئی پیش گوئی نہیں کر سکے۔

1980ء کی دہائی میں گورباچیف کے دور میں سٹالنسٹ افسر شاہانہ ڈھانچے میں رہتے ہوئے کچھ اصلاحات کے ذریعے معیشت کو بحال کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن اِس سے تضادات شدید تر ہی ہوئے۔انقلاب کی تنہائی، سوشلزم کی مسخ شدہ 'قومی شکل' اور مزدور جمہوریت کی عدم موجودگی میں معاشی بدانتظامی آخرکار سوویت یونین کے انہدام پر منتج ہوئی۔درحقیقت یہ انقلاب کی افسر شاہانہ زوال پذیری کا وہی عمل تھا جو 1920ء کی دہائی کے وسط میں شروع ہوا اور 1991ء میں اپنے انجام کو پہنچا۔سوویت یونین میں سوشلزم یا کمیونزم نہیں بلکہ اِس کی مسخ شدہ شکل، یعنی سٹالنزم ناکام ہوا۔

آج سوویت یونین کے انہدام کو 27 سال گزر چکے ہیں۔اس عرصے میں جس قدر بربادیاں دنیا بھر کے عام انسانوں نے دیکھی ہیں اس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ جہاں ایک فیصد امیر ترین افراد کے پاس 99 فیصد آبادی سے زیادہ دولت ہے۔ جنگ، خانہ جنگی، دہشت گردی اور معاشی جارحیت نے پورے کے پورے معاشرے تاراج کر دیئے ہیں اور کئی ریاستیں ٹوٹ کر بکھر چکی ہیں۔شام اور عراق سے لیکر لیبیا اور یمن تک انارکی اور خونریزی کا راج ہے۔لیکن پھر بھی یہ رٹ لگائی جاتی ہے کہ سوشلزم ناکام ہو چکا ہے! مارکسزم متروک ہو چکا ہے! سرمایہ داری کو 'ٹھیک' کرنے کے لئے اصلاحات کا راگ تو الاپا جاتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی اِس نظام پر بات کرنا ممنوع بنا دیا گیا ہے۔ پاکستان میں لبرل اور سیکولر دانشوروں سے لیکر بنیاد پرستوں اور ملاؤں تک سب ''تاریخ کے خاتمے'' پر یقین رکھتے ہیں اور فوکویاما کے چیلے بن چکے ہیں۔ویسے اگر سوشلزم

ابدی موت مر چکا ہے تو بار بار اِس کی موت کا اعلان کرنے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟ سوویت یونین کے 27 سال بعد بھی ڈونلڈ ٹرمپ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں اپنی پہلی تقریر میں سوشلزم کی بار بار مذمت کی ضرورت کیوں محسوس کر رہا تھا؟ آج بھی پاکستان کے مروجہ دانشور یہ کیوں لکھ رہے ہیں کہ بس اب تو چند روز کی بات ہے کہ سوشلزم اور مارکسزم کے نام لیوا ختم ہو جائینگے؟ سامراجی حکمرانوں اور مغربی یونیورسٹیوں کے جن سکالروں کی پیروی ہمارے مذہبی اور لبرل دانشور کرتے ہیں ان کا سوشلزم سے یہ خوف بے سبب نہیں ہے۔ مارکس کی زندگی میں صرف ایک پرولتاری انقلاب (پیرس کمیون) فتح یاب ہوا تھا جب تاریخ میں پہلی مرتبہ محنت کشوں نے 70 دن تک اقتدار پر قبضہ کیا تھا۔ اس انقلاب کو خون میں ڈبو دیا گیا۔ اس کے بعد بارہ سال مارکس نے سوشلزم اور کمیونزم کے نظریات اور لائحہ عمل کو مزید نکھارنے اور وسعت دینے میں گزار دیئے۔ سوویت یونین بھی 70 سال بعد ٹوٹ گیا۔ لیکن کیا مارکسزم کا نظریہ غلط ثابت ہو گیا؟ کیا استحصال، طبقاتی تفریق اور کشمکش ہی ختم ہو چکی ہے؟ سرمایہ داری کے رکھوالے درحقیقت خود اپنے نظام کی بربادی اور تاریخی متروکیت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

معاشروں کو بدلنے والے انقلابات برپا کرنے کے لئے سوچ اور فکر کی بے باکی اور تاریخی وسعت درکار ہوتی ہے۔ تنگ نظر شعور، چھوٹی سوچ اور سطحی فکر صرف وقتی کیفیات اور ظاہریت تک محدود ہوتی ہے۔ اگر تاریخی ارتقا کے اعتبار سے دیکھا جائے تو نسل انسان کی تاریخ میں دہائیاں بھی چند لمحات کی طرح ہوتی ہیں۔ انسانوں کی زندگیاں بھی بہت مختصر ہوتی ہیں۔ لیکن جب تک کسی معاشرے میں طبقات موجود رہیں گے ان کے درمیان کشمکش بھلا کیسے ختم ہو سکتی ہے؟ طبقاتی جدوجہد بھلا کیسے مٹ سکتی ہے؟ لینن نے بالشویک انقلاب کے بعد اپنی تصنیف ’مارکسزم کے تین اجزائے ترکیبی‘ میں واضح کیا تھا کہ مارکسزم اس لئے اٹل ہے کیونکہ یہ سچ ہے۔ آج تک مارکسزم کا متبادل کوئی ایسا فلسفہ اور نظریہ نہیں آسکا جو سائنسی بنیادوں پر نہ صرف سماج کی تشریح اور وضاحت کر سکے بلکہ محرومی، جبر اور استحصال سے نجات کا راستہ اور منزل بھی واضح کرے۔

سرمایہ داری تاریخی طور پر متروک نظام ہے اور نسل انسان کی اذیت میں اضافہ ہی کر سکتا ہے۔ آج سرمایہ داری زائد پیداوار، زائد پیداواری صلاحیت اور شرح منافع میں گراوٹ کے اُسی

نامیاتی بحران کا شکار ہے جس کی نشاندہی مارکس نے کی تھی۔ حتیٰ کہ سنجیدہ اور دور اندیش بورژوا معیشت دان بھی اِس بحران کی نامیاتی نوعیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ آج کی تحریکوں اور بغاوتوں کو مارکسزم کے انقلابی نظریات کی ضرورت ہے۔ 1917ء میں انقلاب کی خبر دو ہفتوں بعد برصغیر پہنچی تھی۔ لیکن آج انقلابات ٹیلیوژن اور انٹرنیٹ پر براہ راست دیکھے جاتے ہیں۔ لہٰذا آج اگر بالشویک انقلاب جیسا کامیاب سوشلسٹ انقلاب برپا ہوتا ہے تو اسے قومی حدود میں مقید کرنا پہلے سے کہیں زیادہ مشکل ہو جائے گا۔ سوویت یونین کے انہدام کے باوجود بالشویک انقلاب آج بھی نسل انسان کی نجات کی جدوجہد کے لئے مشعل راہ ہے۔ سرمایہ داری کے سنجیدہ پالیسی ساز بھی اِس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اُن کے استحصالی نظام کو حقیقی خطرہ آج بھی انقلابی سوشلزم سے ہے۔

لینن اور ٹراٹسکی نے روس سے شروع ہونے والے انقلاب کو پھیلانے اور دنیا بھر کے لوگوں کو یکجا کر کے پورے کرہ ارض کو 'سوویت جمہوریاؤں کی یونین' (USSR) بنانے کا عزم کیا تھا۔ آج کے عہد میں کسی ایک ملک میں سوشلسٹ فتح پورے سیارے پر انقلابی طوفان پیدا کر سکتی ہے۔ ایک سوشلسٹ سماج میں ہی انسان محرومی اور مانگ سے آزاد ہو کر اپنے وجود کے حقیقی مقصد، یعنی کائنات کی تسخیر کی طرف گامزن ہو گا۔

لال خان

نومبر 2017ء

*****

کیا پاکستان ایک جاگیردارانہ سماج ہے؟

اصلاح پسند دانشور پچھلی کئی دہائیوں سے یہ گردان دہرا رہے ہیں کہ پاکستان ایک جاگیردارانہ ملک ہے اور جاگیرداری کا خاتمہ 'قومی جمہوری' یا 'عوامی جمہوری' نوعیت کے سرمایہ دارانہ انقلاب سے ہی ممکن ہے۔ لیکن پچھلے 65 سالوں سے پاکستانی بورژوازی' جاگیرداری کے نشانات اور اس سے منسلک مخصوص جاگیردارانہ ذہنیت اور اقدار مٹانے میں ناکام رہی ہے۔ حالات وواقعات یہی بتاتے ہیں کہ موجودہ حکمران طبقات اوران کی بحران زدہ سرمایہ داری' جاگیرداری کی باقیات (جنہیں یہ دانشور 'جاگیردارانہ رشتوں' کا نام دیتے ہیں) مٹانے کے قابل نہیں ہیں۔

اگر اس سماج کی سماجی و معاشی بنیادوں کا جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ پاکستان کو 'جاگیردارانہ معاشرہ' کہنا مغالطہ ہے۔ یہاں سرمایہ دارانہ رشتے بہت مضبوط جڑیں پکڑ چکے ہیں۔ تیسری دنیا کی سرمایہ داری کے مخصوص لاغر پن، اقتصادی و تکنیکی کمزوری اور تاریخی تاخیرزدگی کے باعث پاکستانی حکمران طبقات نہ صرف جاگیرداری کی باقیات کا خاتمہ کرنے میں ناکام رہے ہیں بلکہ اس کے برعکس جاگیردار اشرافیہ کو حاکمیت کے گٹھ جوڑ میں شامل کرنے کا موجب بنے ہیں۔ اس ملغوبے نے سماجی و معاشی انفراسٹرکچر کو تباہ کرتے ہوئے ایک بنجر اور مسخ شدہ ثقافت کو جنم دیا ہے اور یہ سب اس خطے کے عوام کی تباہی و بربادی کا موجب بنا ہے۔

تاہم کلاسیکی جاگیرداری، جو یورپ کے سماجی ارتقا کا ایک حصہ تھی، اس خطے میں کبھی بھی موجود نہیں رہی۔ اس خطے میں حاوی سماجی نظام ایشیائی طرزِ پیداوار یا 'ایشیائی استبداد' رہا ہے۔ ہزاروں سال تک نافذ العمل رہنے والے اس نظام میں یورپی جاگیرداری کے برعکس وسیع و عریض زمینوں کی نجی ملکیت موجود نہیں تھی۔ ایشیائی طرزِ پیداوار نے نسبتاً مساوی معاشرے کو جنم دیا لیکن یہ باقی دنیا سے کٹا رہنے کے باعث قدامت کا شکار ہو گیا اور غیر ملکی حملہ آوروں کے لئے

آسان شکار بن گیا۔ تاہم زیادہ تر غیر ملکی حملہ آوروں کا ثقافتی معیار نسبتاً کم تھا اور وہ آہستہ آہستہ اس خطے کی بلند ثقافت میں ضم ہو گئے جو زرخیز زمین، بہتے دریاؤں اور زرعی بہتات کی پیداوار تھی۔

برطانوی نوآبادکار وہ پہلے حملہ آور تھے جو اس ثقافت میں تحلیل نہیں ہوئے کیونکہ نشاۃ ثانیہ اور صنعتی انقلاب سے گزرنے کے بعد وہ نہ صرف تکنیکی اور عسکری بلکہ ثقافتی لحاظ سے بھی اعلیٰ معیار کے حامل تھے۔ برصغیر میں جاگیرداری مصنوعی طور پر انگریزوں کی طرف سے نافذ کی گئی تاکہ نوآبادیاتی اقتدار کو مضبوط کیا جاسکے اور مقامی اشرافیہ کی ایک فرماں بردار پرت پیدا کی جاسکے۔ اس عمل کا آغاز 1793ء میں بنگال پارلیمنٹ میں لارڈ پالمرسٹن کی طرف سے متعارف کروائے گئے 'مستقل آبادکاری بل' سے ہوا۔ بنگال کے بعد یہ پالیسی تمام تر برصغیر میں لاگو کی گئی۔ پاکستان کی جاگیردار اشرافیہ کی کلاسیکی آبائی بنیادیں نہیں ہیں بلکہ یہ وسیع و عریض زمینیں انہیں انگریزوں نے وفاداری اور مقامی لوگوں سے غداری کرتے ہوئے آزادی کی تحریکوں کو کچلنے میں مدد دینے پر عطا کی تھیں۔

اپنی ابتدا ہی سے پاکستان کی نومولود لیکن تاریخی طور پر تاخیر زدہ بورژوازی زرعی انقلاب سمیت قومی جمہوری انقلاب کے دوسرے فرائض ادا کرنے کے قابل نہیں تھی۔ سامراجیوں نے پاکستان کو تائیوان اور جنوبی کوریا کی طرز پر ایک سرمایہ دارانہ ملک کے طور پر نشوونما دینے کی کوشش کی۔ ایوب خان کی آمریت نے رابرٹ میکنمارا، جو اس وقت ورلڈ بنک کا سربراہ تھا، کی ہدایات پر زرعی اصلاحات کرنے کی کوششیں کیں لیکن یہ اصلاحات جاگیرداری کی باقیات کو مٹانے میں ناکام رہیں۔ سب سے زیادہ ریڈیکل اصلاحات ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت میں کرنے کی کوشش کی گئی لیکن بوسیدہ سرمایہ دارانہ ریاستی ڈھانچے کی وجہ سے یہ اصلاحات مکمل نہیں ہو سکیں۔ کرپٹ بیوروکریسی کیساتھ گٹھ جوڑ کے ذریعے جاگیردار اشرافیہ بڑی ضبطیوں سے بچ نکلی۔ جاگیرداروں میں خوف و ہیبت بہرحال موجود تھی۔ 1981ء میں شائع ہونے والی 'UNDP' کی ایک رپورٹ کے مطابق 1974ء کے آخر تک 100 ایکڑ سے زیادہ 96 فیصد جاگیریں بینکوں میں گروی رکھی جا چکی تھیں۔ جاگیرداروں نے گروی پہ ملنے والا یہ بیش بہا سرمایہ صنعت اور سروسز کے شعبے میں لگایا۔ مصنوعی جاگیردار اس طرح مصنوعی سرمایہ دار بن گئے۔ اگر ان جاگیروں کو ضبط کیا

جاتا ہےتو بینکنگ سسٹم دھڑام ہوجائے گا۔

سرمایہ داری میں رہتے ہوئے انتہائی ریڈیکل زمینی اصلاحات بھی نہ تو زرعی انقلاب مکمل کر سکتی ہیں اور نہ ہی زراعت کو جدید سطور پر استوار کرتے ہوئے بے زمین ہاریوں اور دہقانوں کی زندگی میں سدھار لاسکتی ہیں۔ بھارت کی کئی ریاستوں میں لاتعداد کسان جنہیں نہرو کے دور میں زمینیں الاٹ کی گئی تھیں، اب اپنی ہی زمینوں پر ٹھیکیداروں کے لئے انتہائی خوفناک حالات میں اجرتی مزدوروں کے طور پر کام کرنے پر مجبور ہیں۔ تبادلہ اجناس پر مبنی جاگیردارانہ معیشت پاکستان میں کہیں بھی اپنا وجود نہیں رکھتی۔ زرعی شعبے میں مالیاتی سرمایہ بہت گہری سرایت کر چکا ہے۔ بلکہ اب تو بہت سی زمینیں کارپوریٹ فارمنگ کے لئے سامراجی اجارہ داریوں کو دی جارہی ہیں۔ چھوٹی زمینوں پر کاشتکاری کے اخراجات' اجناس کی فروخت سے ملنے والی آمدن سے بہت زیادہ ہیں۔ منڈی کے دباؤ کی وجہ سے منافع بخش فصلوں کو اناج اگانے پر فوقیت دی جاتی ہے جس کی وجہ سے بھوک بڑھ رہی ہے۔ زرعی مسئلے کو سرمایہ دارانہ نظام حل کرنے سے قاصر ہے۔ الٹا اس کا اپنا معاشی واقتصادی بحران زراعت کے شعبے کو تباہ کر رہا ہے۔ غریب کسان نسل در نسل قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں اور ان کی زندگیاں جہنم بن چکی ہیں۔ کسانوں کی نجات مزدور طبقے کی قیادت میں کی جانے والی سماجی تبدیلی کی جدوجہد میں ہی مضمر ہے۔

لال خان

جولائی 2012ء

*****

مارکسی اساتذہ کی مختصر سوانح حیات

کارل مارکس

کارل مارکس 5 مئی 1818ء کو پروشیا (موجودہ جرمنی) کے صوبہ رھائن کے شہر ٹریئر (Trier) میں پیدا ہوا۔ مارکس کے والد ایک یہودی وکیل تھے جنہوں نے 1824ء میں مسیحی فرقے پروٹسٹنٹ کا مذہب قبول کر لیا تھا۔ پورا گھرانہ خوش حال اور مہذب تھا، لیکن انقلابی نہیں تھا۔ ٹریئر میں جمنازیم کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مارکس نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ پہلے بون اور پھر برلن یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم حاصل کی اور خاص طور سے تاریخ اور فلسفے کا مطالعہ کیا۔ 1841ء میں اُس نے یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کی اور اپیکیو ریس (Epicurus) کے فلسفے پر اپنا تحقیقی مقالہ ڈاکٹری کی سند حاصل کرنے کے لئے پیش کر دیا۔ خیالات کے لحاظ سے کارل مارکس اس وقت تک ہیگل کے عینی (خیال پرستانہ) نظریئے سے متاثر تھا۔ برلن میں بھی اس کا تعلق ''بائیں بازو کے ہیگلیوں'' (مثلاً برونو باور وغیرہ) کے حلقے سے تھا۔ ان لوگوں کی کوشش یہ رہتی تھی کہ ہیگل کے فلسفے سے لامذہبیت کے خیالات اور انقلابی نتائج اخذ کریں۔

یونیورسٹی سے گریجویٹ ہو چکنے کے بعد مارکس شہر بون آ گیا جہاں اس کا ارادہ پروفیسری کا تھا۔ لیکن حکومت کی پالیسی سخت رجعتی تھی۔ حکومت نے فلسفی لڈوگ فیور باخ کو 1832ء میں یونیورسٹی کی مسند سے نکال دیا تھا، 1836ء میں اسے یونیورسٹی واپس آنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا اور 1841ء میں نوجوان پروفیسر برونو باور کے بون یونیورسٹی میں لیکچر دینے پر پابندی لگا دی تھی۔ یہ سب دیکھ کر مارکس نے ایک استاد کی زندگی بسر کرنے کے ارادے ترک کر دیئے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب بائیں بازو کے ہیگلیوں کے خیالات جرمنی میں بڑی تیزی سے پھیل رہے تھے۔ لڈوگ فیور باخ نے بالخصوص 1836ء کے بعد دینیات پر کھلی نکتہ چینی

شروع کردی تھی اور مادیت کی جانب راغب ہونے لگا تھا جو آگے چل کر 1841ء میں اُس کے فلسفے پر حاوی ہوگئی۔ 1843ء میں اس کی کتاب 'مستقبل کے فلسفے کے اصول' سامنے آئی۔ ان کتابوں کے بارے میں اینگلز نے آگے چل کر لکھا کہ ان کی ''آزادی بخش دینے والی تاثیر نا قابل بیان تھی۔ ہم (یعنی بائیں بازو کے ہیگلی، جن میں مارکس بھی شامل تھا) سب کے سب فوراً فیور باخی بن گئے۔'' ان ہی دنوں رھائن علاقے کے کچھ ریڈیکل بورژوا لوگوں، جو بائیں بازو کے ہیگلیوں سے رابطے میں تھے، نے کولون شہر سے ایک مخالفانہ پرچہ 'رھائن کا اخبار' (Rheinische Zeitung) نکالا۔ یکم جنوری 1842ء کو اس کا پہلا شمارہ آیا۔ مارکس اور برونو باور کو خاص طور سے اس پرچے کے لئے لکھنے کی دعوت دی گئی۔ اکتوبر 1842ء میں کارل مارکس اس پرچے کے چیف ایڈیٹر ہو گئے اور شہر بون سے کولون منتقل ہو گئے۔ مارکس کی ادارت میں اس پرچے کا انقلابی جمہوری رنگ زیادہ سے زیادہ نکھرتا گیا۔ پہلے تو حکومت نے اس پر دوہری تہری سنسر شپ لگائی، پھر یکم جنوری 1843ء کو پرچے کو کچلنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس سے قبل ہی مارکس کو مجبوراً ادارت سے استعفیٰ دینا پڑا، لیکن اُس کا استعفیٰ پرچے کو بچا نہیں سکا اور بالآخر مارچ 1843ء میں اشاعت منقطع کر دی گئی۔ اخباری سرگرمیوں نے مارکس پر واضح کر دیا کہ سیاسی معاشیات سے اس کی واقفیت کافی نہیں تھی، چنانچہ اس نے پورے جوش وخروش سے اس کے مطالعہ کا آغاز کر دیا۔

مارکس نے 1843ء میں کروزناخ شہر میں اپنی بچپن کی دوست، جس سے زمانہ طالب علمی میں ہی اُس کی شادی طے ہو چکی تھی، سے شادی کر لی۔ مارکس کی بیوی کا تعلق پروشیا کی اشرافیہ کے ایک رجعتی گھرانے سے تھا۔ اس کا بڑا بھائی 58-1850ء کے نہایت رجعتی دور میں پروشیا کا وزیر داخلہ بھی رہا۔ 1843ء کے موسم خزاں میں مارکس پیرس چلا گیا تا کہ وہاں سے آرنلڈ روگے (1880-1802ء) کیساتھ ایک ریڈیکل رسالہ نکال سکے۔ روگے بھی اُس وقت بائیں بازو کا ہیگلی تھا۔ اس رسالے کا صرف ایک ہی شمارہ نکل پایا اور جرمنی میں چوری چھپے اسے تقسیم کرنے کی مشکلات اور روگے سے اختلافات کی وجہ سے اشاعت منقطع ہوگئی۔ تاہم اِس رسالے میں مارکس کے مضامین واضح کرتے ہیں کہ وہ ایک انقلابی بن چکا تھا جو ''ہر موجود چیز پر

بے رحم تنقید' بالخصوص ''ہتھیاروں کے ذریعے تنقید'' کی وکالت کرتا تھا اور عوام اور پرولتاریہ سے استدعا کرتا تھا۔

ستمبر 1844ء میں فریڈرک اینگلز کچھ دنوں کے لئے پیرس آیا اور اس کے بعد سے مارکس کا قریب ترین دوست بن گیا۔ دونوں اُس وقت پیرس میں انقلابی گروہوں کی جوش کھاتی زندگی کا سرگرم حصہ بن گئے ۔ اُس وقت پرودھون (Proudhon) کا نظریہ خاص اہمیت کا حامل تھا، جسے مارکس نے 1847ء میں اپنی تصنیف 'فلسفے کی غربت' میں شدید تنقید کا نشانہ بنا کر پارہ پارہ کر دیا۔ مارکس اور اینگلز نے پیٹی بورژوا سوشلزم کے مختلف نظریات کے خلاف سخت جدوجہد کا آغاز کیا اور پرولتاری سوشلزم یا کمیونزم (مارکسزم) کی حکمت عملی اور نظریات وضع کئے۔ 1845ء میں پروشیائی حکومت کے لگاتار اصرار پر مارکس کو خطرناک انقلابی قرار دے کر پیرس سے نکال دیا گیا۔ وہ برسلز چلا گیا۔ 1847ء کے موسم بہار میں مارکس اور اینگلز نے ایک خفیہ پروپیگنڈا سوسائٹی 'کمیونسٹ لیگ' میں شمولیت اختیار کر لی۔ وہ لیگ کی دوسری کانگریس (لندن، نومبر 1847ء) میں بہت نمایاں تھے اور اسی کانگریس کے کہنے پر انہوں نے مشہورِ زمانہ 'کمیونسٹ مینی فیسٹو' مرتب کیا، جو فروری 1848ء میں چھپ کر سامنے آیا۔ نہایت وضاحت اور کمال ذہانت سے اِس تصنیف نے دنیا کا ایک نیا تصور پیش کیا جو مادیت، جدلیات، طبقاتی جدوجہد کے نظریئے اور ایک نئے کمیونسٹ سماج کے خالق کے طور پر پرولتاریہ کے تاریخی انقلابی کردار سے مطابقت رکھتا تھا۔

جب فروری 1848ء کا انقلاب شروع ہوا تو مارکس کو بیلجیم سے بھی نکال دیا گیا۔ وہ پیرس واپس آ گیا، جہاں سے مارچ کے انقلاب کے بعد وہ کولون (جرمنی) چلا گیا۔ کولون میں یکم جون 1848ء سے 19 مئی 1849ء تک 'رھائن کا نیا اخبار' (Neue Rheinische Zeitung) شائع ہوا، جس کا چیف ایڈیٹر مارکس تھا۔ 1848ء تا 49ء کے انقلابی واقعات نے بڑے شاندار طریقے سے نئے نظریئے کی تصدیق کی، بالکل جیسے بعدازاں دنیا بھر کی پرولتاری اور جمہوری تحریکوں نے کی ہے۔ فتح یاب ہونے والے ردِانقلاب نے پہلے تو مارکس کے خلاف عدالتی کاروائی شروع کر دی (9 فروری 1849ء کو مارکس اس مقدمے سے بری ہو گیا) اور پھر 16 مئی 1848ء کو اسے جرمنی سے نکال دیا گیا۔ مارکس پیرس گیا لیکن 13 جون 1849ء کے

مظاہرے کے بعد دوبارہ پھر نکال دیا گیا۔ یہاں سے وہ لندن چلا گیا، جہاں وفات تک رہا۔

ایک سیاسی جلاوطن کی حیثیت سے مارکس کی زندگی بہت کٹھن تھی، جیسا کہ مارکس اور اینگلز کے درمیان خط و کتابت (جو 1913ء میں شائع ہوئی) سے بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ غربت مارکس اور اس کے خاندان پر بہت بھاری تھی۔ اگر اینگلز کی مستقل اور بے لوث مالی امداد نہ ہوتی تو مارکس نہ صرف 'سرمایہ' کی تحریر مکمل نہیں کر پاتا بلکہ ناگزیر طور پر غربت کے ہاتھوں کچلا جاتا۔ مزید برآں پیٹی بورژوا سوشلزم اور بالعموم غیر پرولتاری سوشلزم کے مروجہ نظریات اور رجحانات نے مارکس کو مسلسل اور بے رحم جدوجہد کرنے اور بعض اوقات انتہائی وحشیانہ اور ننگ انسانیت ذاتی حملوں کا مقابلہ کرنے پر مجبور کیا۔ سیاسی جلاوطنوں کے حلقوں سے الگ تھلگ رہ کر مارکس نے کئی تاریخی تحریروں میں اپنے مادیت کے نظریئے کو پروان چڑھایا اور سیاسی معاشیات کے مطالعے کے لئے خود کو وقف کر دیا۔ مارکس نے 'سیاسی معاشیات کے تنقیدی جائزے پر مضمون' (1859ء) اور 'سرمایہ' (جلد اول، 1867ء) کے ذریعے سائنس میں انقلاب برپا کر دیا۔

انیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے اواخر اور ساتویں دہائی میں جمہوری تحریکوں کے احیا نے مارکس کو دوبارہ عملی سرگرمی کی طرف کھینچا۔ 28 ستمبر 1864ء میں لندن میں 'انٹرنیشنل ورکنگ مین ایسوسی ایشن' قائم کی گئی جو پہلی انٹرنیشنل کے نام سے مشہور ہے۔ مارکس اس تنظیم کے روحِ رواں تھے۔ وہ اس کے پہلے خطبے اور بے شمار قراردادوں، اعلامیوں اور منشوروں کے لکھاری تھے۔ قبل از مارکسی، غیر پرولتاری سوشلزم کی مختلف شکلوں کی مزدور تحریکوں کو متحد کر کے مارکس نے مختلف ممالک کی پرولتاری جدوجہد کے لئے ایک یکجا حکمت عملی مرتب کی۔ 1871ء میں پیرس کمیون کے انہدام ('فرانس میں خانہ جنگی' نامی تصنیف میں مارکس نے اس واقعے کا جامع، واضح، شاندار، مؤثر اور انقلابی تجزیہ پیش کیا ہے) اور باکونن کی وجہ سے انٹرنیشنل میں پڑنے والی دراڑ کے بعد یہ تنظیم یورپ میں قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ 1872ء میں انٹرنیشنل کی ہیگ کانگریس کے بعد مارکس نے اس کی جنرل کونسل کو یورپ سے نیویارک منتقل کرا دیا۔ پہلی انٹرنیشنل نے اپنا تاریخی کردار ادا کر دیا تھا اور تمام دنیا میں مزدور تحریک کی وسیع تر بڑھوتری کے عہد کی راہ ہموار کر دی تھی۔ ایک ایسا عہد جس میں تحریک نے وسعت اختیار کی اور مختلف قومی ریاستوں میں سوشلسٹ مزدور پارٹیاں

قائم ہوئیں۔

انٹرنیشنل کے لئے انتھک کام اور اس سے بھی بڑھ کر انتھک فکری مصروفیات نے مارکس کی صحت کو بری طرح متاثر کیا۔ اُس نے سیاسی معاشیات کو از سرِ نو مرتب کرنے اور 'سرمایہ' کو مکمل کرنے کا کام جاری رکھا، جس کے لئے اُس نے بہت سا نیا مواد اکٹھا کیا اور کئی زبانوں (مثلاً روسی زبان) کا مطالعہ کیا۔ تاہم صحت کی خرابی نے اسے 'سرمایہ' کی تصنیف مکمل نہ کرنے دی۔

2 دسمبر 1881ء کو اُس کی شریک حیات وفات پا گئی اور 14 مارچ 1883ء کو مارکس اپنی آرام کرسی پر اطمینان بھری ابدی نیند سو گیا۔ لندن کے ہائی گیٹ قبرستان میں وہ اپنی بیوی کے پہلو میں دفن ہے۔ مارکس کے بچوں میں سے کچھ لندن میں بچپن میں ہی فوت ہو گئے، جب خاندان کو سخت افلاس کا سامنا تھا۔ تین بیٹیوں (یولینگ، لا ورا لافارگ اور جینی لونگے) نے انگریز اور فرانسیسی سوشلسٹوں سے شادیاں کر لیں۔ جینی لونگے کا بیٹا فرانسیسی سوشلسٹ پارٹی کا رُکن ہے۔

ولادیمیر لینن

1914ء

*****

فریڈرک اینگلز

فریڈرک اینگلز 1820ء میں پروشیائی سلطنت (موجودہ جرمنی) کے صوبہ رھائن کے مشہور شہر بریمن میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کارخانہ دار تھا۔ 1838ء میں خاندان کے حالات سے مجبور ہو کر بیٹے نے ہائی سکول کی تعلیم چھوڑی اور بریمن کے ایک تجارتی دفتر میں کلرکی اختیار کر لی۔ کاروباری مصروفیات کے باوجود اینگلز نے اپنی سائنسی اور سیاسی تعلیم کی لگن باقی رکھی۔ ہائی سکول کے زمانے سے ہی اسے بادشاہت اور سرکاری اہلکاروں کے ظلم زبردستی سے سخت نفرت ہو گئی تھی۔ فلسفہ پڑھا تو یہ نفرت اور منجھ گئی۔ ان دنوں جرمن فلسفے پر ہیگل کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اینگلز

بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ اگر چہ ہیگل بذات خود پروشیا کی شخصی حکومت کا مداح تھا اور برلن یونیورسٹی میں فلسفے کا پروفیسر ہونے کی حیثیت سے اسی حکومت کا نمک خوار بھی رہا تھا، تاہم اس کی تعلیمات انقلابی تھیں۔ ہیگل کو انسانی عقل اور اس کے حقوق پر یقین تھا۔ ہیگلی فلسفے کا بنیادی نکتہ تھا کہ تمام کائنات کے رگ و پے میں تغیر، تبدیلی اور ارتقا جاری و ساری ہے۔ ان نظریات کی بدولت اس جرمن فلسفی کے بعض شاگردوں (جو اُس وقت کی صورتحال کو برحق ماننے کو تیار نہ تھے) نے یہ خیال اپنا لیا کہ اس صورت حال، موجودہ بدی اور مروجہ برائی کے خلاف جدوجہد بھی ازلی و ابدی ارتقا کے آفاقی قانون کی بنیاد میں شامل ہے۔ اگر ہر چیز بدلتی ہے، اگر ایک قسم کے اداروں کی جگہ دوسری قسم کے ادارے لے لیتے ہیں تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ پروشیائی بادشاہ سلامت یا زارِ روس کی فرماں روائی یا لوگوں کی بہت بڑی تعداد کے نقصان سے تھوڑے سے لوگوں کی دولت مندی یا عام لوگوں پر سرمایہ دار طبقے کا غلبہ ایسے ہی ہمیشہ چلتا رہے؟ ہیگل کا فلسفہ سوچ اور خیالات کے ارتقا کی بات کرتا تھا۔ یہ خیال پرستانہ تھا۔ سوچ کے ارتقا سے یہ فطرت، انسان اور سماجی تعلقات کا ارتقا اخذ کرتا تھا۔ ہیگل کی جانب سے پیش کردہ ازلی و ابدی ارتقائی عمل کے تصور کو برقرار رکھتے ہوئے مارکس اور اینگلز نے اُس کے خیال پرستانہ نقطہ نظر کو مسترد کر دیا۔ انہوں نے واضح کیا کہ فطرت کے ارتقا کی وضاحت سوچ کے ارتقا سے نہیں کی جاسکتی بلکہ اس کے برعکس سوچ کی وضاحت فطرت، یعنی مادے سے کی جانی چاہئے۔ ہیگل اور دوسرے ہیگلیوں کے برعکس مارکس اور اینگلز مادیت پسند تھے۔ دنیا اور انسانیت کو مادی نقطہ نظر سے دیکھتے ہوئے انہوں نے جانا کہ جیسے تمام قدرتی مظاہر کے پیچھے مادی وجوہات کارفرما ہوتی ہیں ویسے ہی انسانی سماج کی ترقی کا انحصار مادی قوتوں، یعنی پیداواری قوتوں کی ترقی پر ہوتا ہے۔ پیداواری قوتوں کی ترقی پر ہی وہ رشتے منحصر ہوتے ہیں جن میں ضروریاتِ زندگی کی پیداوار کے عمل میں انسان بندھ جاتے ہیں۔ انہی رشتوں میں تمام سماجی زندگی، انسانی امنگوں، خیالات اور قوانین کی وضاحت مضمر ہوتی ہے۔ پیداواری قوتوں کی ترقی سے نجی ملکیت پر مبنی سماجی رشتے تشکیل پاتے ہیں، لیکن اب ہم دیکھ سکتے ہیں کہ پیداواری قوتوں کی یہی ترقی اکثریت کو ملکیت سے محروم کر کے اسے معمولی سی اقلیت کے ہاتھوں میں مجتمع کر دیتی ہے۔ یہ ترقی جدید سماجی نظام کی بنیاد، یعنی نجی ملکیت کو موقوف کر کے خود ہی اُس نصب العین

کی طرف گامزن ہے جو سوشلسٹوں نے اپنے لئے متعین کیا ہے۔ اب سوشلسٹوں کو یہ ادراک حاصل کرنا ہے کہ وہ کونسی سماجی قوت ہے جو جدید سماج میں اپنی حیثیت کی بدولت سوشلزم کو عملی جامہ پہنانے میں دلچسپی رکھتی ہے اور پھر انہیں اِس قوت کو اس کے مفادات اور تاریخی فریضے کا شعور عطا کرنا ہے۔ یہ قوت پرولتاریہ ہے۔

اینگلز نے اسی پرولتاریہ سے برطانیہ کی صنعت کے مرکز مانچسٹر میں آگاہی حاصل کی تھی، جہاں اُس نے 1842ء میں سکونت اختیار کی تھی اور ایک ایسی تجارتی کمپنی کی نوکری کرتا تھا جس میں اینگلز کا باپ بھی حصہ دار تھا۔ مانچسٹر میں اینگلز صرف کارخانے کے دفتر میں ہی نہیں بیٹھا رہا بلکہ ان جھونپڑ پٹیوں میں بھی پھرتا تھا جہاں مزدور لبالب بھرے ہوتے تھے۔ وہ اُن کی غربت اور اور بدحالی کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ لیکن اس نے خود کو صرف ذاتی مشاہدوں تک ہی محدود نہیں رکھا۔ برطانیہ کے محنت کش طبقے کے حالات کے بارے پہلے سے جو لکھا جا چکا تھا اینگلز نے اس کا بھی مطالعہ کیا اور اُن تمام سرکاری دستاویزات کا بغور مطالعہ کیا جن تک اُس کی رسائی تھی۔ ان تمام مطالعوں اور مشاہدوں کا حاصل وہ کتاب تھی جو 1845ء میں شائع ہوئی: 'برطانیہ میں محنت کش طبقے کی حالت'۔ اینگلز سے پہلے بھی بہت لوگوں نے پرولتاریہ کے مصائب بیان کئے تھے اور اس کی مدد کرنے کی ضرورت ظاہر کی تھی۔ لیکن اینگلز وہ پہلا شخص ہے جس نے کہا کہ پرولتاریہ ایک مصیبت زدہ طبقہ ہی نہیں ہے بلکہ درحقیقت پرولتاریہ کی شرمناک معاشی حالت ہی اسے آگے بڑھاتی ہے اور مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنی حتمی نجات کی لڑائی لڑے۔ اور پرولتاریہ جب لڑائی کے میدان میں اترے گا تو اپنی مدد آپ کرلے گا۔ محنت کش طبقے کی سیاسی تحریک ناگزیر طور پر محنت کشوں کو باور کروائے گی کہ اُن کی واحد نجات سوشلزم میں مضمر ہے۔ دوسری طرف سوشلزم ایک قوت اسی وقت بنے گا جب یہ محنت کش طبقے کی سیاسی جدوجہد کا نصب العین بنے گا۔ برطانیہ میں محنت کش طبقے کی حالت پر اینگلز کی کتاب کے یہی کلیدی خیالات ہیں۔ اب ان خیالات کو تمام سوچنے اور جدوجہد کرنے والے پرولتاریوں نے اپنا لیا ہے، لیکن اُس وقت یہ بالکل نئے اور انجانے تھے۔ یہ خیالات ایک ایسی کتاب میں پیش کئے گئے تھے جو بہت جاذب انداز میں لکھی گئی تھی اور برطانیہ کے پرولتاریہ کی ذلت کی انتہائی مستند اور لرزا خیز تصویر کشی سے لبریز تھی۔ یہ کتاب

سرمایہ داری اور بورژوازی کے خلاف خوفناک فردِ جرم تھی اور گہرا اثر چھوڑ گئی۔ جدید پرولتاریہ کی حالت زار کی بہترین تصویر کشی کے طور پر اینگلز کی کتاب کے حوالے ہر جگہ دیئے جانے لگے۔ درحقیقت 1845ء سے پہلے یا بعد محنت کش طبقے کی ذلت کی ایسی غیر معمولی اور حقیقی عکاسی نہیں کی گئی ہے۔

برطانیہ آنے کے بعد اینگلز سوشلسٹ ہو گیا۔ مانچسٹر میں اس نے برطانیہ کی مزدور تحریک میں سرگرم لوگوں سے رابطے بنائے اور انگریزی سوشلسٹ پرچوں کے لئے لکھنے لگا۔ 1844ء میں جرمنی واپس جاتے ہوئے پیرس میں اُس کی شناسائی مارکس سے ہوئی، جس سے اُس کی خط و کتابت پہلے سے جاری تھی۔ پیرس میں فرانسیسی زندگی اور فرانسیسی سوشلسٹوں کے زیر اثر مارکس بھی سوشلسٹ ہو چکا تھا۔ یہاں ان دونوں دوستوں نے مل کر ایک کتاب لکھی جس کا عنوان 'مقدس خاندان' یا 'تنقیدی تنقید پر تنقید' تھا۔ یہ کتاب، جو اینگلز کی 'برطانیہ میں محنت کش طبقے کی حالت' سے ایک سال پہلے شائع ہوئی اور جس کا زیادہ تر حصہ مارکس نے لکھا، انقلابی مادی سوشلزم کے بنیادی نکات کی حامل تھی۔ ''مقدس خاندان'' کا لفظ باور نامی جرمن بھائیوں (Bauers) اور ان کے پیرکاروں پر ایک پھبتی کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ یہ حضرات ایسی تنقید کا پرچار کرتے تھے جو تمام حقیقت، پارٹیوں اور سیاسیات سے ماورا تھی، جو تمام عملی سرگرمی کو مسترد کرتی تھی اور جو گردوپیش کی دنیا اور اس میں رونما ہونے والے واقعات پر صرف ''تنقیدی'' نظر ڈالنے سے غرض رکھتی تھی۔ پرولتاریہ کو یہ معززین ایک غیر ناقدانہ ہجوم کے طور پر حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مارکس اور اینگلز نے اس بیہودہ اور نقصان دہ رجحان کی زبردست مخالفت کی۔ ایک جیتے جاگتے انسانی وجود، یعنی مزدور جو حکمران طبقات اور ریاست کے بوجھ تلے کچلا جا رہا ہے، کے لئے انہوں نے قیاس آرائی کا نہیں بلکہ ایک بہتر سماجی نظام کی جدوجہد کا مطالبہ کیا۔ ظاہر ہے کہ ان کی نظر میں پرولتاریہ ہی وہ طاقت تھی جو ایسی جدوجہد کرنے کی اہلیت اور اس سے دلچسپی رکھتی تھی۔ 'مقدس خاندان' کی اشاعت سے بھی پہلے فریڈرک اینگلز نے مارکس اور روگے کے مجموعہ مضامین میں اپنے 'سیاسی معاشیات پر تنقیدی مضامین' شائع کر دیئے تھے، جن میں اُس نے سوشلسٹ نقطہ نظر سے ہم عصر معاشی نظام کے کلیدی مظاہر کا معائنہ کیا اور انہیں نجی ملکیت کی حاکمیت کے ناگزیر

مضمرات قرار دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مارکس کی جانب سے سیاسی معاشیات کا مطالعہ کرنے کے فیصلے میں اینگلز سے رابطے کا اہم کردار تھا۔ مارکس کی تصانیف نے سیاسی معاشیات کی سائنس میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔

1845ء سے 1847ء تک اینگلز برسلز اور پیرس میں رہا اور سائنسی کام کے ساتھ ساتھ برسلز اور پیرس کے جرمن مزدوروں میں عملی کام کرتا رہا۔ یہاں مارکس اور اینگلز نے خفیہ 'جرمن کمیونسٹ لیگ' سے رابطہ قائم کیا، جس نے انہیں ذمہ داری سونپی کہ سوشلزم کے جو کلیدی اصول انہوں نے اخذ کئے تھے انہیں تفصیل سے بیان کریں۔ چنانچہ مارکس اور اینگلز کا مشہور 'کمیونسٹ پارٹی کا مینی فسٹو' تیار ہوا جو 1848ء میں شائع کیا گیا۔ یہ کتابچہ کئی کئی جلدوں کی کتابوں پر حاوی ہے۔ اس کی روح آج تک مہذب دنیا کے سارے منظّم اور لڑاکا پرولتاریہ کو شکتی اور رہنمائی دے رہی ہے۔

1848ء کا انقلاب جو فرانس میں پھوٹ کر مغربی یورپ کے دوسرے ملکوں میں پھیل گیا، مارکس اور اینگلز کو ان کے آبائی وطن (جرمنی) واپس لے گیا۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے پروشیا کے صوبہ رھائن میں جمہوری اخبار 'Neue Rheinische Zeitung' کا انتظام سنبھالا جو کولون شہر سے شائع ہوا کرتا تھا۔ یہ دونوں دوست صوبہ رھائن کی تمام انقلابی جمہوری امنگوں کے روحِ رواں بن گئے۔ وہ عوام کے مفادات اور آزادی کے دفاع میں رجعتی قوتوں کے خلاف جم کر لڑے۔ لیکن جیسا کہ ہمیں معلوم ہے رجعت جیت گئی۔ یہ اخبار کچل کر ختم کر دیا گیا۔ مارکس، جو اپنی جلاوطنی کے زمانے میں پروشیائی شہریت سے محروم ہو چکا تھا، اب جلاوطن کر دیا گیا۔ اینگلز نے مسلح عوامی بغاوت میں حصہ لیا، تین جنگوں میں آزادی کے لئے لڑا اور جب باغیوں کو شکست ہوئی تو وہ پسپا ہو کر سوئٹزرلینڈ کے راستے لندن کی طرف نکل گیا۔

مارکس بھی لندن میں ہی مقیم ہو چکا تھا۔ اینگلز نے وہاں پہنچ کر پھر کلرکی اختیار کر لی اور کچھ دنوں بعد مانچسٹر کی اسی کمپنی کا حصہ دار بن گیا جس میں 1840ء کی دہائی میں نوکری کر چکا تھا۔ 1870ء تک وہ مانچسٹر میں ہی رہا اور اس عرصہ میں مارکس نے بھی لندن میں رہائش رکھی۔ لیکن یہ فاصلہ ان کے درمیان پرجوش تبادلہ خیال میں حائل نہ ہوا۔ وہ کم وبیش روزانہ خط وکتابت کرتے

رہے۔ اِس خط و کتابت کے ذریعے دونوں دوست اپنے خیالات اور دریافتوں کا تبادلہ کرتے رہے اور سائنسی سوشلزم کی تیاری میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ 1870ء میں اینگلز لندن چلا آیا اور ان کی انتہائی سرگرم مشترکہ نظریاتی زندگی 1883ء میں مارکس کی وفات تک جاری رہی۔اس کا ثمر یہ تھا کہ مارکس نے 'سرمایہ' لکھی جو ہمارے زمانے میں سیاسی معاشیات کی سب سے بڑی تصنیف ہے۔ دوسری طرف اینگلز نے چھوٹی اور بڑی کئی تصانیف پیش کیں۔ مارکس نے سرمایہ دارانہ معیشت کے پیچیدہ مظاہر کے تجزیئے پر کام کیا۔اینگلز نے اپنی سادہ اور آسان تحریروں، جو زیادہ تر مناظرانہ نوعیت کی ہوتی تھیں، میں تاریخ کے مادی نظریئے اور مارکس کے معاشی نظریات کی روح سے ماضی اور حال کے مختلف مظاہر اور عام سائنسی مسائل پر بحث کی۔ ہم اینگلز کی تحریروں میں سے ذیل کا ذکر کرنا چاہیں گے: 'جرمن فلسفی ڈیورنگ سے مناظرہ' (یہ کتاب فلسفے، قدرتی سائنس اور سماجی علوم کے دائرے میں آنے والے انتہائی اہم مسائل کا تجزیہ کرتی ہے)، 'خاندان، نجی ملکیت اور ریاست کا آغاز'، 'لڈوگ فیور باخ'، روسی حکومت کی خارجہ پالیسی پر مضمون، رہائش کے مسئلے پر شاندار مضامین۔اس کے علاوہ دو مختصر مگر نہایت قیمتی مضامین جو روس کے معاشی ارتقا پر لکھے گئے۔سرمائے پر اپنی زبردست تصنیف کو تمام کرنے سے پہلے ہی کارل مارکس کا انتقال ہو گیا۔تاہم اس کا خاکہ مکمل ہو چکا تھا اور اپنے دوست کی وفات کے بعد اینگلز نے 'سرمایہ' کے دوسری اور تیسری جلدوں کی تیاری اور اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔1880ء میں اس نے دوسری اور 1894ء میں تیسری جلد شائع کر دی (اینگلز کی موت نے چوتھی جلد کی تکمیل نہ ہونے دی)۔ان جلدوں کی اشاعت وسیع اور سخت محنت کا نتیجہ تھی۔ دوسری اور تیسری جلد شائع کر کے اینگلز نے اس زبردست عالی دماغ کی ایک عظیم الشان یادگار قائم کر دی جو اس کا دوست رہا تھا، بلکہ ایک ایسی یادگار قائم کر دی جس پر انجانے میں خود اینگلز کا نام بھی نقش ہو گیا ہے۔درحقیقت 'سرمایہ' کی یہ دونوں جلدیں مارکس اور اینگلز کی مشترکہ تصنیف ہیں۔ پرانی داستانوں میں دوستی کی بعض رقت انگیز مثالیں ملتی ہیں۔لیکن یورپی پرولتاریہ کہہ سکتا ہے اس کی سائنس دو ایسے عالموں اور جانبازوں کی دین ہے جن کی باہمی رفاقت' دوستی کے تمام پرانے قصے کہانیوں سے بڑھ کر تھی۔ اینگلز نے ہمیشہ (اور بالعموم درست طور پر) خود کو مارکس کے بعد شمار کیا۔اس نے اپنے ایک

پرانے دوست کو لکھا، ''مارکس کے جیتے جی میں ہمیشہ اس کا نائب رہا۔'' مارکس کی زندگی میں جو محبت اور مرنے کے بعد جو تعظیم اینگلز نے اسے دی اس کی کوئی انتہا نہیں۔ اس بیباک جانباز اور محتاط مفکر کے وجود میں ایک بے پناہ محبت کرنے والی روح سمائی تھی۔

1848-49ء کی تحریک کے بعد مارکس اور اینگلز نے جلاوطنی میں خود کو صرف سائنسی تحقیق تک محدود نہیں رکھا۔ 1864ء میں مارکس نے 'انٹرنیشنل ورکنگ مین ایسوسی ایشن' بنائی اور پورے دس برس تک اس کی قیادت کرتا رہا۔ اینگلز نے بھی اس کے کاموں میں عملی حصہ لیا۔ اِس عالمی تنظیم نے مارکس کے نظریات کے مطابق تمام ممالک کے پرولتاریوں کو متحد کیا اور مزدور تحریک کے ارتقا میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ لیکن 1870ء کی دہائی میں انٹرنیشنل کے بند ہونے کے بعد بھی مارکس اور اینگلز کا متحد کرنے کا کردار ختم نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے برعکس کہا جا سکتا ہے کہ مزدور تحریک کے روحانی رہنماؤں کی حیثیت سے ان کی اہمیت مسلسل بڑھتی رہی، کیونکہ تحریک بذات خود مسلسل پھیل رہی تھی۔ مارکس کی وفات کے بعد اینگلز نے اکیلے ہی یورپی سوشلسٹوں کے رہنما اور صلاح کار کے طور پر کام جاری رکھا۔ اینگلز کی ہدایات اور مشورہ سب کو برابر درکار ہوتا تھا، چاہے وہ جرمن سوشلسٹ ہوں، جن کی طاقت ریاستی جبر کے باوجود مسلسل اور تیزی سے بڑھ رہی تھی، یا پھر پسماندہ ملکوں مثلاً سپین، رومانیہ اور روس کے نمائندے ہوں، جنہیں ابتدائی قدم اٹھانے سے پہلے کافی سوچ بچار اور ناپ تول کرنی پڑ رہی تھی۔ بوڑھے اینگلز کے علم اور تجربے کا بھرپور خزانہ ان سب کے کام آتا رہا۔ آیئے فریڈرک اینگلز کو خراج عقیدت پیش کریں، جو پرولتاریہ کا استاد اور زبردست جانباز تھا!

ولادیمیر لینن

1895ء

*****